سورۂ ہود

آیاتہا ۱۲۳ ۱۱ سورۃ ھود مکیۃ ۵۲ رکوعاتہا ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا کہ سوائے ایک آیت کریمہ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ کے باقی مکی ہے۔ ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں حضرت کعب سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھو''(1)۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ہود، الواقعہ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا(2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس میں سے کچھ حصہ مرسل روایت کیا گیا ہے۔ ترمذی حکیم ابو عبداللہ نے ''نوادر الاصول''(3) میں اس کو روایت کیا ہے کہ ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن بشر نے علی بن صالح عن ابی اسحق عن ابی جحیفہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ ابو عبداللہ نے کہا کہ خوف بوڑھا کر دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف نفس کو کمزور کر دیتا ہے اور جسم کی رطوبت کو خشک کر دیتا ہے۔ ہر بال کے نیچے ایک چشمہ ہوتا ہے اس سے پسینہ پھوٹتا ہے جب خوف اس کی رطوبت کو خشک کرتا ہے تو وہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں پس بال بھی خشک ہو کر سفید ہو جاتے ہیں۔ جس طرح آپ کھیتی کو سیرابی کی وجہ سے شاداب دیکھتے ہیں اور جب اس کی سیرابی ختم ہوتی ہے تو وہ خشک ہو کر سفید ہو جاتی ہے پس بوڑھے آدمی کے بال اس کی رطوبت خشک ہونے کی وجہ سے سفید ہو جاتے ہیں اور اس کی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ پس نفس اللہ کی وعید اور ان خوفوں کی وجہ سے جن کے بارے میں اللہ کی طرف سے خبر آئی ہو کمزور ہو جاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ وہ وعید اور اس کے ساتھ آنے والا خوف اس کے پانی کو خشک کر دیتا ہے پس اس کے سبب بڑھاپا آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا۟ (المزمل) پس وہ خوف کی وجہ سے بوڑھے ہو گئے۔ اور جہاں تک سورۂ ''ہود'' کا تعلق ہے تو اس میں کئی امتوں کا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے جو انہیں جلدی لاحق ہوا اس کا ذکر ہے۔ لہٰذا اہل یقین جب اس کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کی بادشاہی، سلطانی اور دشمنوں کو اس کی پکڑ جیسے معاملات ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اگر خوف کے سبب وہ مرجائیں تو ان کا حق ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اسم گرامی ان اوقات میں ان

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب فضائل القرآن، صفحہ 189، وزارت تعلیم
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ واقعہ، جلد 2، صفحہ 162
3۔ نوادر الاصول، باب الخوف یورث الشیب، صفحہ 224

پر مہربانی فرماتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے کلام کو پڑھتے ہیں۔

اور جہاں تک سورۂ ہود جیسی سورتوں کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ سورتیں ہیں جو سورۂ ہود کے مشابہ ہیں جیسے اَلْحَآقَّةُ، سَاَلَ سَآىِٕلٌ، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اَلْقَارِعَةُ وغیرہ۔ پس ان سورتوں میں ایسی چیزیں ہیں جو عارفین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے عذاب کو واضح کرتی ہیں تو ان کی وجہ سے نفوس کمزور ہوتے ہیں اور انہیں کے سبب سروں میں بڑھاپا آتا ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورۂ ہود میں سے جس چیز نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ جس کا بیان انشاء اللہ بعد میں آئے گا۔ یزید بن اَبان نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپ کے سامنے سورۂ ہود پڑھی جب میں نے اس کو ختم کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے یزید بن اَبان یہ قراءت ہے تو رونا کہاں ہے''۔

ہمارے علماء نے کہا کہ جعفر نحاس نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہود ہے بغیر تنوین کے اس بنیاد پر کہ یہ سورت کا نام ہے کیونکہ اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو وہ منصرف نہ ہوگا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر کہتے ہیں کہ یہ ''ہودٌ'' ہے تنوین کے ساتھ اس وجہ سے کہ یہ سورت کا نام ہے اسی طرح اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو بھی، کیونکہ جب اس کا درمیانی حرف ساکن ہو تو وہ خفیف ہو جاتا ہے تو منصرف ہو جائے گا اور اگر آپ لفظ سورۃ کو حذف کرنا چاہیں تو تمام کے نزدیک منصرف ہوگا۔ پس میں نے کہا: یہ ہود ہے اور آپ اس سے مراد سورۂ ہود لیتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ آپ ھذہ الرحمٰن کہتے ہیں، اگر آپ اس سے ھذہ سورۃ الرحمٰن مراد نہ لیتے تو یہ نہ کہتے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝٢ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤

''الف۔ لام۔ را۔ یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں، پھر ان کی وضاحت کر دی گئی ہے بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اللہ کی، بے شک میں تمہیں اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (صدق دل سے) متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف وہ لطف اندوز کرے گا تمہیں زندگی کی راحتوں سے اچھی طرح مقرر معیاد تک اور عطا کرے گا ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو اس کی زیادہ نیکی (کا ثواب) اور اگر تم (یونہی) روگرداں رہے تو میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ كِتٰبٌ سے مراد ھذا کتاب ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یہ محل

رفع میں ہے کتاب کی صفت ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کے معنی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے عمدہ قول حضرت قتادہ کا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سارے کے سارے کو محکم بنا دیا گیا ہے نہ اس میں کوئی خلل ہے اور نہ ہی یہ باطل ہے۔ الاحکام سے مراد کلام کا فساد سے محفوظ ہونا ہے یعنی اس کی نظم، نظم محکم ہے نہ اس میں تناقض ہے اور نہ کوئی خلل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس سے مراد ہے کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہیں کیا بخلاف تورات اور انجیل کے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس کی بعض آیات کو اس طرح مضبوط بنا دیا گیا ہے کہ وہ ناسخ تو ہیں منسوخ نہیں۔ اس بارے میں گفتگو پہلے ہو چکی ہے (ایتہ سے بعض آیات مراد لینے کی وضاحت کرتے ہیں) بعض اوقات اسم جنس کا اطلاق نوع پر بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: اکلت طعام زید تو اس سے مراد زید کا بعض کھانا ہوتا ہے۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا کہ اس کی آیات کو امر اور نہی کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ ثُمَّ فُصِّلَتْ یعنی وعدے، وعید، ثواب اور عقاب کے ساتھ اس کی وضاحت بیان کی گئی۔ قتادہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے باطل سے اس کو (محفوظ کر کے) پختہ کیا پھر حلال و حرام کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی (1)۔ مجاہد نے کہا: اس کو مکمل طور پر مضبوط کیا گیا پھر توحید، نبوت، بعث بعد الموت اور دیگر عقائد پر حسب ضرورت دلیل کو ایک ایک آیت کر کے بیان کیا گیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوح محفوظ میں اس کو جمع کیا گیا پھر نزول میں تفریق کی گئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ فُصِّلَتْ سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایک ایک آیت کر کے نازل کیا گیا تا کہ اس میں غور و فکر کیا جا سکے۔ عکرمہ نے اس کو فُصِلَتْ بصورت تخفیف پڑھا ہے۔ اس سے مراد ہوگا حکمت بالحق۔

مِنْ لَّدُنْ، لَدُنْ بمعنی عند ہے۔ حَكِيْمٍ سے مراد امور کو پختہ کرنے والی ذات ہے اور خَبِيْرٍ سے مراد وہ ذات ہے جو باخبر ہے ہر اس کام سے جو ہو چکا اور جو نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ کسائی اور فراء نے کہا کہ اَلَّا اصل میں بأن لا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی اس کے ساتھ کہ تم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ زجاج نے کہا کہ یہ لئلا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی تا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو ارشاد فرمائیں کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ، مِّنْهُ کی ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی اللہ سے۔ نَذِيْرٌ یعنی اس کی نافرمانی کرنے والے کو اس کے عذاب اور اس کی سطوت سے ڈرانے والا۔ بَشِيْرٌ اس کی اطاعت کرنے والے کو رضا اور جنت کی خوشخبری سنانے والا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اول و آخر اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں سے ہے یعنی تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بے شک میں تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ اللہ تمہیں غیر کی عبادت سے ڈرانے والا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (آل عمران: 28) اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ پہلے پر اس کا عطف ہے۔ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی اللہ کی طرف لوٹو اطاعت اور عبادت کے ساتھ۔ فراء نے کہا: یہاں ثُمَّ واؤ کے معنی میں ہے یعنی تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ کیونکہ استغفار ہی توبہ ہے اور توبہ ہی استغفار

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 11، صفحہ 207-206

ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ تم اپنے پہلے گناہوں سے استغفار کرو اور نئے گناہ سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرو جب تم سے سرزد ہو۔ بعض صلحاء نے کہا کہ گناہ کو چھوڑے بغیر استغفار کرنا یہ جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے۔ یہ معنی مکمل طور پر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور سورۂ بقرہ میں وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ: 231) کے تحت گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کے ذکر کو مقدم فرمایا ہے کیونکہ مغفرت غرض مطلوب ہے اور توبہ اس کا سبب ہے پس مغفرت مقصود میں اوّل ہے جب کہ سبب میں آخر۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ تم صغیرہ گناہوں سے استغفار کرو اور کبیرہ گناہوں سے توبہ کرو۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا یہ استغفار اور توبہ کا ثمر ہے یعنی وہ تم کو رزق کی وسعت اور زندگی کی خوشحالی سے منافع کے ذریعے لطف اندوز کرے گا اور تمہیں عذاب کے ذریعے جڑ سے نہیں اکھیڑے گا جس طرح اس نے ان کے ساتھ کیا جن کو اس نے تم سے پہلے ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ يُمَتِّعْكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تم کو عمر دے گا۔ الامتاع کی اصل لمبا کرنا ہے (طوالت دینا) ہے۔ اس سے أمتع الله بك و متع به (درازی عمر کی دعا) ہے۔ سہل بن عبداللہ نے کہا کہ المتاع الحسن مخلوق کو ترک کرنا اور حق کی طرف توجہ دینا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد موجود پر قناعت کرنا اور مفقود پر پریشانی کو ترک کرنا ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ایک قول یہ ہے کہ اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد موت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے جب کہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جنت کا داخلہ ہے۔ اس بنیاد پر المتاع الحسن سے مراد قبر اور اس کے علاوہ قیامت کی ہولنا کیوں اور قیامت میں خوف دلانے والے امور اور ہر ناپسندیدہ چیز سے بچانا ہوگا۔ پہلا معنی (یعنی موت) زیادہ ظاہر ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ یہ (معاملہ) موت کی وجہ سے ختم ہوگا اور یہی اجل مسمی ہے۔ واللہ اعلم۔

مقاتل نے کہا کہ انہوں نے انکار کیا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا کی وہ سات سال قحط میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں، گندگی، مردار اور کتوں کو کھایا۔

وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ یعنی وہ نیک اعمال میں سے ہر صاحب عمل کو اس عمل کی جزا دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ بندہ جس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر فضیلت پا گئیں اس کو وہ اپنا فضل یعنی جنت دے گا اور یہی اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَضْلَهٗ میں ہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ مجاہد نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کلام میں سے جو وہ اپنی زبان سے کرتا ہے یا عمل میں سے جو وہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کے ذریعے کرتا ہے جس کو شمار کرتا ہے یا اپنے مال میں سے جس کو بطور صدقہ دیتا ہے پس وہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ اس کو (اس کا اجر) دیتا ہے اگر وہ ایمان لائے اور اس کو وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کرتا اگر وہ کافر ہو تو وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ۔ يَوْمٍ كَبِيْرٍ سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہ دن بڑا ہوگا اس میں واقع ہونے والی ہولنا کیوں کی وجہ سے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم بدر (1) اور اس کے علاوہ (غزوات کے ایام) ہیں۔ و تتولوا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 150

کہ اگر وہ روگرداں رہے تو آپ ان کو فرمادیں کہ میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو اور اس کی ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ان کو فرمادیں کہ اگر تم نے روگردانی کی تو میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ یعنی موت کے بعد، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی ثواب اور عقاب میں سے ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''سنو! وہ دہرا کر رہے ہیں اپنے سینوں کو تا کہ وہ چھپالیں اللہ تعالیٰ سے (اپنے دلوں کا بغض) سنتے ہو! جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں بلا شبہ وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (پوشیدہ) ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے ساتھ مشرکین کے رویے کی خبر دی اور وہ (مشرکین) یہ گمان کرتے کہ ان کے حالات اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہیں یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عداوت و دشمنی کے جذبات کو لپیٹتے (یعنی چھپاتے) ہیں اس میں علی عداوۃ المسلمین کے الفاظ حذف ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود بغض اور دشمنی کو چھپاتے ہیں اور اس کے برعکس ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ ایک شیریں لسان اور شیریں کلام آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسندیدہ طریقے سے ملتا اور آپ کے لیے اپنے دل میں موجود برے جذبات کو چھپالیتا (1)۔

مجاہد نے کہا کہ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ کہ وہ اپنے سینوں کو دہرا کر لیتے شک اور شبہ کی وجہ سے۔ اور حسن نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود کفر کو چھپالیتے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت بعض منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے گزرتے تو بعض منافقین اپنا سینہ اور اپنی پیٹھ دہری کر لیتے، اپنے سر کو جھکا لیتے اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتے تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو دیکھ کر ایمان کی دعوت نہ دے دیں اس کا معنی عبداللہ بن شداد نے بیان کیا ہے۔ مِنْهُ میں ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ منافقین نے کہا کہ جب ہم اپنے دروازے بند کرلیں گے، اپنے کپڑے خوب اوڑھ لیں گے اور اپنے سینے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی پر دہرے کرلیں گے تو ہمیں کون جانے گا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اپنے بدنوں کو ڈھانپ کر عبادت کرتے اور آسمان کے نیچے اپنے بدنوں کو ظاہر نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عبادت تو وہ ہے جس پر ان کے دل قائم ہیں عقیدت میں سے اور جس کو وہ اپنے قول اور عمل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ ابن جریر نے محمد بن عباد بن جعفر سے روایت بیان کی ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اَلَاۤ اِنَّهُمْ تَثْنَوْنِیْ صُدُوْرُهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ کہ وہ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 191

آسمان کی طرف کھلے ہونے کی حالت میں نہ اپنی بیویوں سے جماع کرتے اور نہ ہی پیشاب کرتے (1)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ محمد بن عباد کے علاوہ (کسی اور نے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یہ الا انہم تثنون صدورھم یعنی واو کے بعد بغیر نون کے ہے تنطوی کے وزن پر۔ تثنوی کا معنی اور آخری دونوں قرائتیں قریب قریب ہیں، کیونکہ وہ خود تو دہرا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس (سینہ) کو دہرا نہ کریں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں پر طعن کرتے ہوئے سرگوشیاں کرتے تو ایک دوسرے پر جھک جاتے اور اپنی جہالت کی وجہ سے یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ یہ سمجھتے کہ ان کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی مخفی ہے۔ یستخفوا سے مراد ہے کہ تا کہ وہ اس سے چھپا لیں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یا اللہ تعالیٰ سے۔

اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ یعنی وہ اپنے کپڑوں کے ذریعے اپنے سروں کو ڈھانپتے۔ قتادہ نے کہا کہ بندے کی سب سے زیادہ پوشیدگی والی حالت تب ہوتی ہے جب وہ اپنی پیٹھ کو جھکائے، اپنے کپڑے اوڑھ لے اور اپنے دل میں اپنے غم کو چھپالے (2)۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۞

"اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس میں مانافیہ ہے اور من زائدہ ہے اور دابۃ محل رفع میں ہے تقدیر عبارت میں وما دابۃ ہے۔ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا، علی بمعنی من ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق ہے اس پر مجاہد کا قول دلالت کرتا ہے کہ رزق میں سے جو کچھ بھی آیا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (3)۔ ایک قول یہ ہے کہ علی اللہ سے مراد اللہ کے فضل کے طور پر ہے نہ کہ اس سے وجوب مراد ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی طرف سے سچے وعدے کے طور پر ہے۔ اس معنی کا بیان "سورۃ النساء" میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کوئی چیز واجب نہیں۔ رِزْقُهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جب کہ کوفیوں کے نزدیک صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ آیت کا ظاہر عموم پر دلالت کر رہا ہے جب کہ اس کا معنی مخصوص ہے، کیونکہ (دواب) جانداروں میں سے بہت سارے رزق دیے جانے سے پہلے ہی ہلاک ہو گئے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عام ہے ہر ایک کے بارے میں ہے اور ہر وہ جاندار جس کو ایسا رزق نہ دیا گیا جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا تو اس کی روح کو تو رزق دیا گیا۔ اور ماقبل کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کے رزق کی خبر دی اور وہ ذات اس چیز کی تربیت سے غافل نہیں تو اے گروہ کفار! تمہارے حالات اس پر کیسے مخفی ہو سکتے ہیں اس حال

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 677
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 212
3۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 5

میں کہ وہ تمہیں رزق دیتا ہے؟ الدابۃ سے مراد ہر وہ حیوان ہے جو رینگ کر چلتا ہے اور حقیقت میں رزق وہ ہے جس کے ذریعے زندہ کو غذا دی جاتی ہے اور اس میں اس کی روح کی بقا اور اس کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے۔ رزق کا معنی ملک ہونا صحیح نہیں کیونکہ جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے جب کہ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ اپنے چارے کے مالک بھی ہیں۔

اسی طرح بچوں کو دودھ بطور رزق دیا جاتا ہے مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ پستان میں جو دودھ ہے وہ بچے کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: 22) کہ آسمان میں تمہارا رزق ہے حالانکہ آسمان میں ہماری کوئی ملکیت نہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ رزق اگر ملکیت ہوتا تو جب کوئی آدمی کسی غیر کی ملکیت میں سے کھاتا تو وہ کسی غیر کے رزق میں سے کھاتا حالانکہ یہ محال ہے، کیونکہ بندہ صرف اپنا ہی رزق کھاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ کسی آدمی کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: جس نے چکی کو پیدا کیا ہے وہ اسے پیسنے کے ذریعے دیتا ہے اور وہ ذات جس نے وادیوں کے کناروں کو وسیع کیا وہی رزق پیدا کرنے والا ہے۔

ابو اُسید کو کہا گیا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: پاک ہے اللہ کی ذات اور اللہ سب سے بڑا ہے! اللہ تعالیٰ کتے کو رزق دیتا ہے تو کیا وہ ابو اُسید کو رزق نہیں دے گا۔ حاتم الاصم کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: اللہ کی طرف سے، اس کو کہا گیا: اللہ تمہارے لیے آسمان سے دراہم اور دینار اتارتا ہے؟ تو اس نے کہا: گویا اس کا صرف آسمان ہے یا یہ زمین بھی اس کی ہے اور آسمان بھی اس کا ہے۔ پس اگر وہ آسمان سے مجھے میرا رزق نہ دے تو وہ اسے زمین میں سے میرے لیے بھیج دیتا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا۔

وكيف أخافُ الفقرَ واللهُ رازقي ورازقُ هذا الخلقِ في العُسرِ واليُسرِ

تكفَّلَ بالأرزاقِ للخلقِ كلِّهم وللضَّبِّ في البيداءِ والحوتِ في البحرِ

اور مجھے فقر کا کیا خوف اس حال میں کہ اللہ میرا رازق ہے اور وہ اس مخلوق کا رازق ہے تنگی اور خوشحالی میں۔ وہ ساری مخلوق کے رزق کا کفیل ہے، وہ گوہ کے رزق کا کفیل ہے اس کے بل میں اور مچھلی کے رزق کا کفیل ہے سمندر میں۔

حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" (1) میں اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اشعریوں کی ایک جماعت جو حضرت موسیٰ، حضرت ابو مالک اور حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھی۔ جب انہوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ سفر میں جو کھانا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کا سوال کرنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا جب وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے ایک آدمی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اس شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشعریوں کی بہ نسبت چوپایوں کو رزق دینا زیادہ آسان تو نہیں ہے۔ وہ واپس آ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گیا اور اس نے اپنے اصحاب سے کہا: تم کو خوشخبری ہو تمہارے پاس مدد آنے

1۔ نوادر الاصول، باب ابو موسیٰ، صفحہ 253

والی ہے۔ اس کے اصحاب نے یہی سمجھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا ہوگا اور آپ نے کھانا بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہوگا، اسی دوران دو آدمی ان کے پاس برتنوں میں کھانا لے کر آگئے جن میں گوشت کا سالن اور روٹیاں تھیں۔ انہوں نے سیر ہوکر کھانا کھایا، پھر اس شخص نے اپنے بعض اصحاب سے کہا: تم یہ کھانا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤ کیونکہ ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں، پھر جب وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے لیے جو کھانا بھیجا تھا اس سے عمدہ اور لذیذ کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے تو تمہیں کوئی کھانا نہیں بھیجا''۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے کیا کیا تھا اور اپنے اصحاب سے کیا کہا تھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو اللہ نے یہ رزق دیا تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا یعنی زمین میں سے جہاں اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ وَمُسْتَوْدَعَهَا یعنی وہ جگہ جس میں وہ مرے گا اور اس کو دفن کیا جائے گا۔ یہ بات مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہی ہے۔ اور ربیع بن انس نے کہا کہ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد اس کی زندگی کے دن ہیں (1)۔ وَمُسْتَوْدَعَهَا سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ مرے گا اور جہاں سے اٹھایا جائے گا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد رحم (مادر) ہے۔ وَمُسْتَوْدَعَهَا سے مراد صلب (باپ) ہے۔ اور ایک قول یہ ہے يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا سے مراد جنت یا دوزخ میں (ان کا ٹھکانہ ہے) اور مُسْتَوْدَعَهَا سے مراد قبر میں (ٹھکانہ ہے) اہل جنت اور اہل دوزخ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۝ (الفرقان) اور سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۝ (الفرقان) اس (معنی) پر دلالت کرتا ہے۔ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ یعنی لوح محفوظ میں۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝

''اور وہی (خدا) ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا (زمین اور آسمان پیدا کیے) تاکہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا ہے عمل کے لحاظ سے اور اگر آپ (انہیں) کہیں کہ یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اس کا بیان ''سورۂ اعراف'' میں گزر چکا ہے۔ والحمدللہ۔ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عرش اور پانی کی تخلیق، زمین اور آسمان کی تخلیق سے پہلے ہے (2)۔ حضرت کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا فرمایا پھر جلال کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 6-7
2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 8

کے خوف سے کانپتا ہوا پانی ہو گیا۔ اس وجہ سے ابھی تک پانی مضطرب رہتا ہے اگرچہ وہ رکا ہوا ہی ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا اور پانی کو ہوا کی پشت پر رکھ دیا پھر عرش کو پانی پر رکھ دیا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا: ان سے اللہ تعالیٰ عزوجل کے ارشاد وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: پانی کس چیز پر تھا؟ تو آپ نے فرمایا: ہوا کی پشت پر۔

امام بخاری نے حضرت عمران بن حصین (1) سے روایت کیا: انہوں نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو تمیم کے لوگ آئے۔ آپ نے فرمایا: ''اے بنو تمیم! بشارت کو قبول کرو''۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں بشارت تو دے چکے ہیں اب ہم کو عطا فرمائیں۔ (یہ مکالمہ دوبار ہوا) پھر اہل یمن میں سے کچھ لوگ آئے، آپ نے فرمایا: ''اے اہل یمن! بشارت کو قبول کرو اگرچہ بشارت کو بنو تمیم نے قبول نہیں کیا''۔ انہوں نے کہا: ہم نے قبول کر لیا، ہم آئے تاکہ ہم دین کے بارے میں سمجھیں اور تاکہ ہم آپ کے پاس اس امر (دنیا) کے متعلق پوچھیں کہ وہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور ذکر (لوح محفوظ) میں اس نے ہر چیز لکھ دی۔ پھر میرے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا: اے عمران! اپنی اونٹنی پکڑ وہ تو چلی گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں نکلا تو وہ میرے سامنے والے سراب کو عبور کر چکی تھی اور اللہ کی قسم! میں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ چلی گئی اور میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے) نہ اٹھوں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا تاکہ وہ اپنے بندوں کو اپنی قدرت کے کمال اور بعث بعد الموت پر استدلال اور نصیحت کے ذریعے آزمائے۔ قتادہ نے کہا: اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی ہے تم میں سے ازروئے عقل کے کون زیادہ کامل ہے؟ حضرت حسن اور سفیان ثوری نے کہا: تم میں سے دنیا میں سب سے زیادہ زہد والا کون ہے؟ اور بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سوئے ہوئے آدمی کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے سونے والے اٹھ اور عبادت کر، اس نے کہا: اے روح اللہ! میں عبادت کر چکا۔ آپ نے فرمایا: تم نے کس طرح عبادت کی؟ اس نے کہا: میں نے دنیا کو اس کے اہل کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: تو سو جا تو نے عبادت گزاروں پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ ضحاک نے کہا: تم میں سب سے زیادہ شکر ادا کرنے والا کون ہے؟ مقاتل کے نزدیک تم میں سے اللہ سے زیادہ ڈرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سب سے زیادہ عمل کرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تلاوت فرمائی۔ آپ نے فرمایا: ''تم میں سے ازروئے عقل کے کون بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کے محارم سے کون زیادہ بچنے والا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کون سب سے زیادہ جلدی کرنے والا ہے (2)؟ تمام تاویلات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ ان شاء اللہ ''سورۂ کہف'' میں بھی آئے گا۔ جب کہ ابتلا کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بعث بعد الموت پر رہنمائی فرمائیں۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، وفد بنی تمیم، جلد 2، صفحہ 626

2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 460

بعث بعد الموت کو شرکین کے سامنے ذکر کریں تو وہ کہیں گے: یہ جادو ہے۔ انکم میں ان مکسور ہے کیونکہ یہ قول کے بعد واقع ہے اور سیبویہ نے فتحہ بیان کیا ہے (یعنی انکم) لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا، لَيَقُوْلَنَّ لام مفتوح ہے کیونکہ یہ ایسا فعل مقدم ہے جس میں ضمیر نہیں ہے اور اس کے بعد لَيَقُوْلَنَّ ہے کیونکہ اس میں ضمیر ہے۔ وسحر یعنی غرور اور باطل ان کے نزدیک جادو کے باطل ہونے کی وجہ سے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سٰحِرٌ مُّبِيْنٌ پڑھا ہے، نبی کریم ﷺ سے کنایۃً۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''اور اگر ہم ملتوی کر دیں ان سے عذاب کچھ عرصہ تک تو (از راہ مذاق) کہیں گے کہ کس چیز نے روک دیا ہے اس عذاب کو۔ وہ کان کھول کر سن لیں جس دن عذاب آجائے گا ان پر تو نہیں پھیرا جاسکے گا ان سے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا وہ تمسخر اڑایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ، لَئِنْ میں ''لام'' قسم کا ہے اور لَيَقُوْلُنَّ کا ''لام'' جواب قسم ہے۔ اِلٰٓى اُمَّةٍ کا معنی ہے معدود مدت اور معلوم زمانے تک (1)، یہاں اُمَّةٍ کا معنی مدت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور جمہور مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور اُمَّةٍ کی اصل جماعت ہے اور حین اور سنین کو اُمَّةٍ کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ اُمَّةٍ اس میں ہوتی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا مضاف الیہ حذف ہے اور معنی ہے الی مجیء امۃ جس میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لاتا پس وہ ہلاکت کے مستحق ہو جاتے یا الی انقراض امۃ یعنی ایسی امت کے گزرنے تک جس میں وہ ہے جو ایمان لاتا ہے پس اس کے گزرنے کے بعد جو ایمان لاتا وہ باقی نہ رہتا۔ اور امت اسم مشترک ہے اس کی آٹھ صورتیں بنتی ہیں۔

امت جماعت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ (القصص:23) اس پر اس نے لوگوں کی جماعت کو پایا۔ اور امت انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کو بھی کہتے ہیں، امت سے مراد بھلائی کا وہ جامع آدمی ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (النحل:120) بے شک ابراہیم ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار۔ امت سے مراد دین اور ملت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (الزخرف:22) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا۔ امت سے مراد حین اور زمان ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ اور اگر ہم ملتوی کر دیں عذاب کچھ عرصہ تک اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف:45)

امت سے مراد قد و قامت بھی ہے اس سے مراد انسان کی لمبائی اور اس کی بلندی ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: فلان حسن الامۃ یعنی فلاں اچھی قامت والا ہے۔ اور امت سے مراد وہ آدمی بھی ہے جو اپنے دین میں منفرد ہو اس میں کوئی بھی اس کا شریک نہ ہو نبی کریم ﷺ نے فرمایا يُبْعَثُ زَيْدُ بْنُ عَمْرِو بْنُ نُفَيْلٍ اُمَّةً وَحْدَهٗ (2) زید بن عمرو بن نفیل کو اکیلا اٹھایا جائے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 11
2۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 496

گا۔ امت سے مراد ماں (الام) ہے کہا جاتا ہے: هذه امة زيد یعنی زید کی ماں۔ لَيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ یعنی عذاب۔ انہوں نے یہ یا تو اس عذاب کی تکذیب کرتے ہوئے کہا ان سے اس عذاب کے مؤخر ہونے کی وجہ سے یا پھر جلدی کرتے ہوئے اور استہزا کرتے ہوئے کہا، اس سے مراد یہ ہے: کس چیز نے ہم سے اس کو روک کے رکھا۔ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ کہا گیا ہے: یہ غزوۂ بدر میں مشرکین کا قتل ہے، اور جبرئیل کا قتل کرنا ہے ان مذاق کرنے والوں کو جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔ وَ حَاقَ بِهِمْ یعنی وہ نازل ہوا اور اس نے احاطہ کیا۔ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی جزا اس کی جس کا وہ مذاق کیا کرتے تھے۔ اس میں مضاف محذوف ہے۔

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

”اور اگر ہم چکھائیں کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت (کا مزہ) پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے تو وہ بڑا مایوس (اور) ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے کوئی نعمت اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دور ہو گئیں سب تکلیفیں مجھ سے۔ بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا، اترانے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے کم ظرف نہیں ہوتے) وہی ہیں جن کے لیے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، الْاِنْسَانَ تمام کفار کے بارے میں جنس کے لیے مشترک نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انسان سے مراد ولید بن مغیرہ ہے اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی۔ رَحْمَةً یعنی بطور نعمت۔ ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ یعنی ہم اس (نعمت) کو اس سے سلب کرلیں گے۔ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ یعنی رحمت سے مایوس ہونے والا۔ كَفُوْرٌ یعنی نعمتوں کا انکار کرنے والا۔ ابن اعرابی نے یہ کہا ہے۔ نحاس نے کہا: لیؤوس، یئس ییأس سے ہے۔ سیبویہ نے کہا: یئس ییأس اور یأس ییئس ہے اور بعض کہتے ہیں: یئس ییئس ہے۔ کلام عرب میں سوائے ان چار حروف کے سالم سے فَعِل یَفْعِل کے وزن پر کوئی اور صیغہ نہیں جانا گیا اور ان میں سے ایک میں اختلاف ہے اور وہ ہے یئس ویؤوس کثرت کے طور پر جس طرح مبالغہ کے لیے فخور آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ یعنی صحت، خوشحالی اور رزق میں وسعت بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ یعنی نقصان، فقر اور شدت کے بعد۔ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ یعنی وہ غلطیاں جو غلطی کرنے والے کو بری لگتی ہیں نقصان اور فقر میں سے۔ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ یعنی وہ خوش ہوتا ہے اور وسعت میں سے جو کچھ اس کو ملا اس کی وجہ سے فخر کرتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا بھول جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فاخر جب وہ فخر کرے اور فخور مبالغہ کے لیے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا: بعض اہل مدینہ نے لفرح پڑھا ہے را کے ضمہ کے ساتھ جس طرح کہا جاتا ہے: رجل فطن وحذر وندس۔ اور ان دونوں لفظوں کو

ساکن کرنا بھی جائز ہے ضمہ اور کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا یعنی مومنین، اللہ تعالیٰ نے شدائد پر صبر کی وجہ سے ان کی تعریف فرمائی اور یہ محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: یہ استثنا ہے مگر پہلے میں سے نہیں، یعنی لیکن وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نعمت اور محنت دونوں حالتوں میں نیک عمل کیے۔ فراء نے کہا: یہ ولئن اذقناہ سے استثنا ہے یعنی انسان سے پس انسان بمعنی ناس (لوگ) ہے۔ اور الناس کافر اور مومن دونوں کو شامل ہے پس یہ استثنا متصل ہے اور یہ عمدہ ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَّ اَجْرٌ معطوف ہے۔ كَبِیْرٌ اس کی صفت ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ؕ﴿۱۲﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾

''پس کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ کا سینہ (اس اندیشہ سے) کہ کافر کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے، آپ فرمائیے: (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لیے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم (اس الزام تراشی میں) سچے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ یعنی شاید آپ ان کی طرف سے جو کفر اور تکذیب دیکھتے ہیں اس کو بڑا خیال کریں اور یہ گمان کریں کہ وہ آپ کو وحی کے بعض حصہ سے ہٹا دیں گے۔ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے کہا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ آپ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ کلام کا معنی استفہام ہے یعنی کیا آپ چھوڑ دیں گے جو قرآن میں ان کے بتوں کو برا بھلا کہا گیا ہے جس طرح کہ وہ آپ سے سوال (مطالبہ) کرتے ہیں؟ اور آپ پر تبلیغ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے امر کو اور زیادہ پختہ فرما دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ: 67) اے رسول! تبلیغ کیجیے اس کی جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: کلام کا معنی نفی مع استبعاد ہے (اس بات کو بعید خیال کرنا) یعنی آپ کی طرف سے ایسا نہیں ہوگا بلکہ آپ کی طرف جو نازل کیا گیا آپ اس کو (جوں کا توں) پہنچا دیں گے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ کو کہا: اگر آپ ہمارے لیے کوئی ایسی کتاب لے آئیں جس میں ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو تو ہم آپ کی اتباع

کریں گے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنا ترک کرنے کا ارادہ فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ، تَارِكٌ پر اس کا عطف ہے اور صَدْرُكَ اس کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بِهٖ کی ہ ضمیر کا مرجع ما ہے یا بعض ہے یا تبلیغ ہے یا پھر تکذیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ضَآئِقٌ فرمایا ضَيِّقٌ نہ فرمایا تا کہ یہ تَارِكٌ جو کہ اس سے پہلے ہے اس کا ہم شکل (ہم وزن) ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضَآئِقٌ عارض ہے جب کہ ضیق اس سے زیادہ لازم ہے۔ اَنْ يَّقُوْلُوْا محل نصب میں ہے یعنی اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ کہیں گے یا اس سے مراد ہے لئلا یقولوا تا کہ وہ یہ نہ کہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) یہاں اَنْ تَضِلُّوْا سے مراد لئلا تضلوا ہے یا پھر یہ لأن یقولوا ہے۔ لَوْلَآ سے مراد ہے هلا یعنی کیوں نہ۔ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ جو اس کی تصدیق کرتا، عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی نے یوں کہا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ یعنی آپ پر ان کو ڈرانا ہے نہ یہ کہ آپ ان کے لیے لائیں ایسی آیات جن کی وہ تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ یعنی حفاظت کرنے والا اور نگہبان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ، ام بمعنی بل ہے۔ یہ ''سورۂ یونس'' میں گزر چکا ہے یعنی آپ کی نبوت کے بارے میں ان کے اشکال اور ان کے اعتراضات اس قرآن کے ذریعے ختم ہو گئے اور آپ نے اس کے ذریعے ان پر حجت قائم کر دی۔ پس اگر وہ کہیں: تو نے اس کو گھڑ لیا ہے یعنی تو نے خود اس کو تخلیق کر لیا ہے۔ پس وہ اپنے گمان کے مطابق اس جیسا گھڑا ہوا لے آئیں۔ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کاہنوں اور مددگاروں میں سے جس کو بلا سکتے ہیں بلا لیں۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

''پس اگر وہ نہ قبول کر سکیں تمہاری دعوت تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ یعنی معارضت (چیلنج) کے بارے میں اور یہ اس کے لیے تیار نہیں تو ان پر حجت قائم ہو چکی کیونکہ وہ بلیغ لغت اور فصیح زبان والے ہیں۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ یعنی تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو جان لو۔ اور جان لو وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی امر ہے اس آیت کے معنی کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور یہ کہ قرآن معجز ہے (مقدمہ کتاب میں) والحمد للہ

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ فَاْتُوْا اور اس کے بعد فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ (اس میں لَكُمْ کے بجائے) لك نہیں کہا۔ ایک قول یہ ہے: یہ مخاطب کو بطور تعظیم وتفخیم مفرد سے جمع کی طرف پھیرنا ہے۔ بعض اوقات رئیس کو (ایسے الفاظ کے ساتھ) خطاب کیا جاتا ہے جن کے ذریعے جماعت کو مخاطب ہوا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْٓا میں ضمیر تمام کے لیے ہے یعنی سب کو جان لینا چاہیے کہ اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ مجاہد نے یوں کہا ہے، اور ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْٓا میں ضمیر مشرکین

کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا اگر وہ جن کو تم نے معاونت کی دعوت دی وہ تمہاری دعوت کا جواب نہ دیں اور تمہارے لیے مقابلہ ممکن نہ ہو۔ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے لَكُمۡ میں ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور فَاعۡلَمُوۡۤا میں مشرکین کے لیے ہے۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ۝

''جو طلب گار ہیں دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے انہیں ان کے اعمال کا اس زندگی میں اور انہیں اس میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان مَنۡ كَانَ میں كَانَ زائدہ ہے، اسی وجہ سے جواب (شرط) مجزوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مَنۡ كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور اس کا جواب نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ ہے اس سے مراد من تکن یرید ہے۔ لفظ پہلا ماضی ہے اور دوسرا مضارع جس طرح زہیر نے کہا:

ومن هابَ أسبابَ المنية يَلْقَها　　ولو رامَ أسبابَ السماء بسلم

جو موت کے اسباب سے بھاگا وہ اس کو ملے گا اگرچہ سیڑھی کے ذریعہ آسمان کے اسباب کا ہی قصد کیوں نہ کرے۔

استشہاد (اس میں 'ھاب'' ماضی ہے جب کہ یلقھا مضارع)

اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ ضحاک نے کہا ہے اور نحاس نے اس کو اختیار کیا ہے اس کے بعد آنے والی آیت کی دلیل کی وجہ سے اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ یعنی ان میں سے جس شخص نے صلہ رحمی اور صدقہ کیا ہم اس کو دنیا میں ہی جسمانی صحت اور کثرت رزق کے ذریعے اس کا بدلہ دیں گے لیکن آخرت میں اس کے لیے کوئی نیکی نہیں۔ ''سورۂ براۃ'' میں یہ معنی مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے آیت سے مراد مومنین ہیں، یعنی جس نے اپنے عمل کے ذریعے دنیا کے ثواب کا ارادہ کیا اسے جلدی ثواب دیا جائے گا اور دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لیے عذاب ہوگا کیونکہ اس کا ارادہ صرف دنیا کا تھا اور یہ (ایسے ہی ہے) جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''(1)۔

پس بندے کو اس کے ارادے کے سبب اور اس کے ضمیر کے فیصلے پر عطا کیا جاتا ہے اور یہ ہر ملت میں تمام قوموں میں متفق علیہ بات ہے۔ ایک قول یہ ہے یہ ریاکاروں کے لیے ہے(2)، حدیث طیبہ میں ہے کہ ریاکاروں کو کہا جائے گا: ''تم نے روزہ رکھا، تم نے نماز پڑھی، تم نے صدقہ کیا، تم نے جہاد کیا اور تم نے تلاوت کی تاکہ تمہیں ایسا کہا جائے پس یہ کہہ دیا گیا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک یہ پہلے لوگ ہوں گے جن پر آگ جلائی جائے گی'' (دوزخ میں ڈالے جائیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، کیف کان بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 18

گے) اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا پھر آپ بہت زیادہ روئے اور کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا (1)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا اور آپ نے دو آیتیں پڑھیں۔

امام مسلم نے اس کو اس کے معنی کے ساتھ اپنی صحیح (مسلم) میں روایت کیا اور ترمذی نے بھی روایت کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت ہر اس آدمی کے بارے میں عام ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی نیت کرتا ہے وہ مومن ہو یا نہ ہو۔ مجاہد اور میمون بن مہران نے یوں کہا ہے، اس جانب حضرت معاویہ گئے ہیں اور میمون بن مہران نے کہا: کوئی بھی آدمی اچھا عمل کرے تو اس کا پورا پورا ثواب دیا جاتا ہے پس اگر مخلص مسلمان ہو تو دنیا و آخرت (دونوں) میں (ثواب) دیا جاتا ہے اور اگر وہ کافر ہو تو دنیا ہی میں پورا بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں دنیا چاہتا ہے تو وہ اس کو دے دی جاتی ہے یعنی غازیوں والا اجر پورا دے دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی (اس معنی کے اعتبار سے) یہ مخصوص ہے جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت کا معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: انما الاعمال بالنیات ہے یعنی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے رمضان میں رمضان کے علاوہ (کوئی اور) روزہ رکھا تو وہ رمضان کا روزہ نہیں ہوگا اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے ٹھنڈک (کے حصول) اور نظافت کی خاطر وضو کیا تو وہ نماز کی طرف سے بطور قربت واقع نہ ہوگا اور اسی طرح ہر وہ حکم جو اس معنی میں ہو (اس کا یہی حکم ہے) (عند المالکیہ)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت مطلق ہے اور اس طرح سورۃ الشوریٰ والی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا الایۃ (الشوریٰ: 20) اس طرح وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ سورۃ سبحان میں موجود آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ سے مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: 18 تا 20) کے ارشاد تک نے اس کی قید اور تفسیر بیان کی ہے۔ اللہ سبحانہ نے خبر دی کہ بندہ نیت اور ارادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کے بارے میں روایت کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ (بنی اسرائیل: 18) کے ذریعے منسوخ ہے اور صحیح وہ ہے جو ہم (قرطبی) نے ذکر کیا ہے اور اس کا تعلق مطلق اور مقید کی بحث سے ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) بھی ہے اس کا ظاہر تو یہ ہے کہ ہر حال میں ہمیشہ ہر پکارنے والے کے جواب کے متعلق خبر ہے حالانکہ اس طرح نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: 41) کی وجہ سے۔ اور اخبار میں نسخ جائز نہیں ہوتا کیونکہ واجبات عقلیہ کی تبدیلی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ محال ہے،

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ، جلد 2، صفحہ 61

جہاں تک احکام شرعیہ کے متعلق اخبار کا تعلق ہے تو ان کا نسخ جائز ہے اس میں اختلاف ہے جس طرح کہ اصول میں مذکور ہے اور اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

''یہ وہ لوگ ہیں نہیں ہے جن کے لیے آخرت میں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا اور (در حقیقت) مٹ جانے والا تھا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ میں ہمیشہ (جہنم میں) رہنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ مومن ہمیشہ (جہنم میں) نہیں رہے گا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ الآیۃ (النساء: 116) بے شک اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ معاف فرمادے گا۔ پس اس کو اس ریاکار کی کفر پر وفات ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ ایک قول یہ ہے لیس لھم الا النار کا معنی یہ ہے کہ وہ معلوم دن آگ میں رہیں گے پھر ان کو نکال لیا جائے گا یا تو شفاعت کے ذریعے یا مٹھی بھرنے کے ذریعے (یعنی پکڑ کر) اور آیت کریمہ ایمان کو سلب کرنے کے ذریعے وعید کا تقاضا کرتی ہے اور گزشتہ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی) حدیث میں کفر اور بالخصوص ریا مراد ہے، کیونکہ یہ بھی شرک ہے جس طرح کہ سورۃ النساء میں اس کا بیان گزر چکا ہے اور سورۃ الکہف کے آخر میں بھی آئے گا۔ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: ھا کو حذف کر دیا گیا ہے، نحاس نے کہا: اس کو حذف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی وباطل عملہ کہ اس کا عمل باطل ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبداللہ کے حرف میں وباطلا ما کانوا یعملون، ما زائدہ ہوگا یعنی وکانوا یعملون باطلا کہ وہ باطل کام کیا کرتے تھے۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

''تو کیا وہ شخص (انکار کر سکتا ہے) جس کے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس کے پیچھے ایک سچا گواہ بھی آ گیا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس سے قبل کتاب موسیٰ بھی آ چکی ہو جو امام اور سراپا رحمت ہے؟ (قطعاً نہیں بلکہ) یہ لوگ تو ایمان لائیں گے اس پر اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں میں سے تو آتش (جہنم) ہی اس کے وعدہ کی جگہ ہے پس (اے سننے والے!) نہ پڑ جا شک میں اس کے متعلق۔ بلاشبہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں

میں سے وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہے اور اس کے پاس وہ فضل ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بیان فرماتا ہے وہ اپنے علاوہ کسی ایسے آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو دنیوی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتا ہے؟ یہ علی بن حسین اور حسن بن ابی الحسن سے مروی ہے۔ اور اسی طرح ابن زید نے بھی کہا ہے۔ بے شک جو روشن دلیل پر ہے وہ وہ ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یعنی اللہ کی طرف سے، اور وہ (شاہد) (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کلام اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ کی طرف راجع ہے یعنی کیا وہ شخص جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان ہو، قرآن کی طرح کا معجزہ ہو، اس کے ساتھ جبریل کی طرح کا گواہ ہو۔ جس طرح کہ آئے گا۔ اور گزشتہ کتب اس کو اس کی خوشخبری سنا چکی ہوں، تبلیغ کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو سکتا ہے؟ اور وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اور رَّبِّهٖ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ کے بارے میں عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ وہ جبریل ہیں۔ یہی مجاہد اور نخعی کا قول ہے۔ مِّنْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہے۔ یعنی بیان اور برہان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ آ گیا ہے، مجاہد نے کہا: شاہد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ ہے جو اس (کتاب) کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور قتادہ نے کہا: شاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ حضرت محمد بن علی بن حنفیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو کہا: کیا آپ شاہد ہیں؟ تو انہوں نے کہا: میں پسند کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں، لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔

ایک قول یہ ہے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ انہوں نے کہا: وہ حضرت علی بن ابی طالب ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: قریش میں سے کوئی آدمی نہیں مگر اس کے بارے میں ایک یا دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ تو کسی آدمی نے آپ کو کہا: آپ کے بارے میں کیا نازل ہوا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ ایک قول یہ ہے شاہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت، آپ کا چہرہ اور آپ کی ہیئت و صورت ہے، کیونکہ جس شخص کو عقل و فضل حاصل ہو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھے تو وہ جان لے گا کہ آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس صورت میں مِّنْهُ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوگی ابن زید اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق۔

ایک قول یہ ہے: شاہد قرآن ہے اپنی نظم، اپنی بلاغت اور ایک لفظ کے کثیر معانی میں۔ حسین بن فضل نے یوں کہا ہے۔ مِّنْهُ کی ضمیر (اس صورت میں) قرآن پاک کے لیے ہوگی۔ فراء نے کہا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ سے مراد انجیل ہے اگرچہ یہ قرآن سے پہلے ہے مگر تصدیق میں قرآن سے پیچھے ہے، (اس صورت میں) مِّنْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگی۔ اور ایک قول یہ ہے بَيِّنَةٍ اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت ہے جو دلوں کو روشن کرتی ہے اور شاہد جو اس کے پیچھے آتا ہے وہ وہ عقل ہے جو اس کے دماغ میں ترکیب پاتی ہے اور اپنے نور کے ذریعے اس کے سینے کو روشن کرتی ہے۔ وَ مِنْ قَبْلِهٖ یعنی انجیل سے پہلے كِتٰبُ مُوْسٰۤى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا کہ معنی یہ ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسی

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 21

کی کتاب اس سے پیچھے آئی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کتاب موسیٰ میں موصوف ہیں۔ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ (الاعراف: 57) وہ اس کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ ابو حاتم نے بعض سے بیان کیا کہ انہوں نے اس کو وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى پڑھا ہے نصب کے ساتھ۔ مہدوی نے کلبی سے اس کو بیان کیا اس کا یَتْلُوْهُ کی ہٗ ضمیر پر عطف ہے اور معنی یہ ہوگا، جبریل علیہ السلام کتاب موسیٰ علیہ السلام کو تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی یہ ہوگا اس سے پہلے جبریل نے کتاب موسیٰ کو موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا۔ وہ بھی درست ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا۔ کتاب مرفوع ہوگی اس بنیاد پر کہ اس کا معنی یہ ہوگا اس سے پہلے کتاب موسیٰ بھی اسی طرح ہے، یعنی جبریل نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا جس طرح اس نے قرآن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تلاوت کیا۔ اِمَامًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے وَّرَحْمَةً معطوف ہے اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ ایمان لاتے ہیں اس بشارت پر جو تورات میں آپ کے متعلق ہے اور ان کے بعد میں آنے والوں نے آپ کا انکار کر دیا، پس یہی ہیں آتش (جہنم) جن کے وعدہ کی جگہ ہے، قشیری نے اس کو بیان کیا ہے۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ یعنی جو بھی کفر کرے قرآن کا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ مِنَ الْاَحْزَابِ یعنی تمام ملتوں میں سے۔، قتادہ سے ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا: الْاَحْزَابِ سے مراد تمام ادیان والے ہیں، کیونکہ ان کے دل اور اعمال مشابہت رکھتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ قریش اور ان کے حلیف ہیں۔ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ یعنی وہ دوزخیوں میں سے ہیں۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے شعر کہا ہے:

أوردتموها حیاضَ الموتِ ضاحیة فالنارُ موعدُها والموتُ لاقیها

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ۙ﴿۱۸﴾ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا۔ یہ لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور کہیں گے گواہ، یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔ خبردار! اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر جو بدنصیب روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور چاہتے ہیں کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں''۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ یعنی ان لوگوں سے زیادہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کسی اور کی طرف منسوب کیا اور یہ گمان کیا کہ وہ اس کا شریک

اور بیٹا ہے۔ اور بتوں کے بارے میں کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے سفارشی ہیں۔ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ۔ یعنی وہ ان کے اعمال پر ان کا محاسبہ کرے گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو یونس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت ہے: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے میرے بارے میں کسی یہودی اور نصرانی نے سنا پھر وہ میری تعلیمات پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا''۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ، شک میں نہ ہو جاؤ۔ مِّنْهُ ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے۔ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ مقاتل نے کہا۔ کلبی نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ کافر کے دوزخ میں ہونے میں شک نہ کرو۔ اِنَّهُ الْحَقُّ، مراد قول حق ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد تمام مکلفین ہیں۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ یعنی حفاظت کرنے والے فرشتے مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ سفیان نے کہا: میں نے اعمش سے اشہاد کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے کہا: اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ ضحاک نے کہا: وہ انبیاء و مرسلین ہیں، ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ (النساء) ہے۔ اور ایک قول کے مطابق وہ فرشتے اور انبیاء ہیں اور وہ علماء ہیں جنہوں نے رسالت کی تبلیغ کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ صحیح مسلم میں صفوان بن محرز عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: جہاں تک کفار اور منافقین کا تعلق ہے تو لوگوں کے سامنے ان کے بارے میں یہ صدا لگائی جائے گی کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر کذب و افتراء سے کام لیا ہے۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یعنی جن لوگوں نے عبادت کو ایسے مقام پر رکھا جو عبادت کے لیے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان پر اپنا غضب نازل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ، الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل رفع میں ہو یعنی هم الذين اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب کی ابتدا ہے، یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو ایمان اور اطاعت سے روکتے ہیں وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی اس طریقے سے وہ لوگوں کو گناہ اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ، هُمْ ضمیر کا اعادہ تاکید کیا گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝

''یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں تھے زمین میں اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار تھا۔ دوگنا کر دیا جائے گا ان کے لیے عذاب نہ وہ (آواز حق) سن سکتے تھے اور نہ وہ (نور حق) دیکھ سکتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے بچنے والے نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: وہ مجھے اس بات سے عاجز نہیں کر سکتے کہ میں زمین کو حکم دوں کہ وہ ان کو نگل لے۔ وَمَا كَانَ لَهُمْ

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ اولیاء سے مراد مددگار ہیں اور من زائدہ ہے اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی الذی ہے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی: اولئک لم یکونوا معجزین لاھم ولا الذین کانوا لھم من اولیاء من دون اللہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یُضٰعَفُ لَہُمُ الۡعَذَابُ یعنی ان کے کفر اور ان کی نافرمانیوں سے دوگنا۔ مَا کَانُوۡا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ السَّمۡعَ، ما اس بنیاد پر محل نصب میں ہے کہ اس کا معنی ہوگا مَا کَانُوۡا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ السَّمۡعَ وَ مَا کَانُوۡا یُبۡصِرُوۡنَ (1) یعنی وہ اسے حق کو سننے اور اسے دیکھنے میں استعمال نہیں کرتے۔

اور عرب اس طرح کلام استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً وہ جس طرح جزیتہ ما فعل کہتے ہیں اسی طرح جزیتہ بما فعل بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات با کو حذف کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اسے ثابت رکھتے ہیں سیبویہ نے شعر پڑھا ہے:

أمرتكَ الخيرَ فافعل ما أمِرتَ به　　فقد تركتكُ ذا مالٍ و ذا نَشَبِ

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما ظرفیہ ہو اور معنی ہو: ان کے لیے ہمیشہ دوگنا فرمائے گا، یعنی ان کے (آوازِ حق) کو سننے اور (نورِ حق) کو دیکھنے کی ان کی استطاعت کے وقت، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں جہنم میں ڈالے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما نافیہ ہو اور اس کا کوئی محل نہ ہو، کیونکہ کلام اس سے پہلے مکمل ہو چکا ہے۔ اور الۡعَذَابُ پر وقف کافی ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں ایسا سننے کی استطاعت نہیں رکھتے جو انہیں نفع دے، اور نہ ہی ایسا دیکھ سکتے ہیں جو ہدایت یافتہ کا دیکھنا ہو۔ فراء نے کہا: وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لوحِ محفوظ سے خارج کر دیا ہے۔ زجاج نے کہا: ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے آپ سے نہ سن سکتے تھے اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ کلام عرب میں معروف ہے کہ جب کسی کے لیے دوسرے کو دیکھنا ثقل کا باعث ہو تو کہا جاتا ہے فلاں، فلاں کو دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۲۲﴾

”یہی وہ (بدقسمت) لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے“۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ یعنی ان سے ان کی بہتان تراشی ضائع اور گم ہو گئی۔

قولہ تعالیٰ: لَا جَرَمَ علماء کے اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں، خلیل اور سیبویہ نے کہا: لَا جَرَمَ بمعنی حق ہے۔ ان دونوں کے نزدیک فلا جرم ایک ہی کلمہ ہے، اور ان ان کے نزدیک محل رفع میں ہے۔ یہ فراء اور محمد بن یزید کا قول ہے۔ اور نحاس نے اس کو بیان کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: خلیل سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی لابد اور لا محالۃ ہے یہ بھی فراء کا قول ہے۔ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا: یہاں لا نافیہ ہے، اور یہ ان کے اس قول کا رد ہے کہ بت انہیں نفع دیں گے،

1۔ تفسیر طبری، جلد 12 صفحہ 29

گویا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں نفع نہیں دیں گے، اور جَرَمَ بمعنی کسب ہے، یعنی اس فعل نے ان کے لیے خسارہ کمایا اور کسب کا فعل مضمر ہے اور ان جرم کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: کسب جفاء ک زید اغضبہ علیک شاعر نے کہا:

نَصبنا رأسه فی جِذْعِ نَخْلٍ بما جَرَمَتْ یداہ وما اعتدینا(1)

شعر میں بما جرمت کا معنی بما کسبت ہے۔ کسائی نے کہا: لا جرم کا معنی لا صد ولا منع ہے ایک قول کے مطابق معنی قطع قاطع ہے کثرت استعمال کی وجہ سے فاعل کو حذف کر دیا گیا اور الجرم سے مراد القطع ہے۔ جرم النحل واجترمہ سے مراد صرمہ ہے اسی طرح قوم جرم اور جرام اور ھذا زمن الجرام والجرام استعمال ہوتا ہے اور جرمت صوف الشاۃ کا مطلب ہے میں نے بکری کی اون کو کاٹا۔ اور جرمت منہ یعنی اخذت منہ ہے جیسے جلمت الشیٔ جلما یعنی میں نے کاٹا۔ اور اگر آپ اس کی ہڈیوں سے گوشت کو اتار لیں تو جلمت الجزور اجلمھا جلما کہا جاتا ہے اور اخذت الشیء بجلمتہ لام ساکن بولا جاتا ہے جب آپ اس باری کو لے لیں اور ھذہ جلمۃ الجزور لام کی حرکت کے ساتھ کا معنی ہے اس کا سارا گوشت، یہ جوہری کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی کا خیال ہے کہ اس کی چار لغتیں ہیں۔ لا جرم لا عن ذا جرم، لا ان ذا جرم اور کسائی نے کہا، بنی فزارہ کے لوگ کہتے ہیں: لا جرانھم یعنی بغیر میم کے پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس کے بارے میں دو اور لغتیں بیان کی ہیں اس نے کہا: بنو عامر لا ذا جرم کہتے ہیں اور عرب کے کچھ لوگ لا جرم پڑھتے ہیں جیم کے ضمہ کے ساتھ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

"بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور عجز و نیاز سے جھک گئے اپنے پروردگار کی طرف۔ یہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، الَّذِیْنَ، اِنَّ کا اسم ہے اور اٰمَنُوْا صلہ ہے یعنی انہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ صلہ پر عطف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَخْبَتُوْۤا کا معنی ہے وہ جھک گئے۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے اطاعت کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے خشوع و خضوع کیا۔ مقاتل نے کہا: انہوں نے اخلاص کا مظاہرہ کیا(2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اخبات سے مراد دل میں موجود خوف کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا خشوع ہے اور اخبات کی اصل استواء ہے، یہ خبت سے مشتق ہے اور اس سے مراد کھلی اور ہموار زمین ہے، لہٰذا اخبات سے مراد خشوع، اطمینان یا مکمل طور پر مسلسل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جھکاؤ ہے۔ اِلٰى رَبِّهِمْ فراء نے کہا: اِلٰى رَبِّهِمْ اور لربھم دونوں ایک ہی ہیں اور اس کا معنی ہوگا انہوں نے اپنے جھکاؤ کا مرکز اپنے رب کو بنایا۔ اُولٰٓىِٕكَ یہ اِنَّ کی خبر ہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 464

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 465-464

''ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو۔ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال کیا تم (اس مثال میں) غور وفکر نہیں کرتے''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ یہ مبتدا ہے اور كَالْاَعْمٰى اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی کمثل الاعمی ہے۔ نحاس نے کہا: تقدیر عبارت: مثل فریق الکافر کالأعمی والأصم ہے اور مثل فریق المومن کالسمیع والبصیر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ يَسْتَوِيٰنِ اس کو فریقین کی طرف لوٹایا گیا اور وہ دو ہیں۔

اس کا معنی حضرت قتادہ اور دیگر سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: الاعمی والأصم کافر کے لیے مثال ہے اور السَّمِيعِ اور الْبَصِيرِ مومن کے لیے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں، اور کیا بہرا اور سننے والا برابر ہیں۔ مثلاً تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم ان دونوں وصفوں میں غور وفکر نہیں کرتے اور نہیں دیکھتے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ٘ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ۝۲۵ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝۲۶

''اور بیشک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا: اے قوم) میں تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ تم نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ تعالیٰ کے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انبیاء علیہم السلام کے قصص کو ذکر کیا تاکہ آپ کفار کی اذیتوں پر صبر کو لازم پکڑیں اور اللہ تعالیٰ ان کے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی ہو جائے گا۔ انی یعنی حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: انی یعنی میں، کیونکہ ارسال میں قول کا معنی موجود ہے۔

ابن کثیر، ابوعمرو اور کسائی نے انی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ارسلناہ بانی لکم نذیر مبین۔ (2) انہ نہیں فرمایا کیونکہ غیب سے حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم کو خطاب کی طرف رجوع فرمایا۔ جس طرح وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ فرمایا اور پھر فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ (الاعراف: 145) فرمایا یعنی پہلے غیب اور پھر مخاطب کے صیغے۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بتوں کو چھوڑ دو، ان کی عبادت نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ جو یکتا ہے اس کی اطاعت کرو، اور جس نے انی کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اسے کلام میں جملہ معترضہ بنایا ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو بھیجا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ یعنی میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 162 2۔ ایضاً

بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝

"تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا (اے نوح) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل (اور) ظاہر بین ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَقَالَ الْمَلَاُ ابو اسحاق زجاج نے کہا: الْمَلَاُ سے مراد سردار ہیں، یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے ذریعے وہ بھر دیتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا بشر سے مراد آدمی ہے۔ مِّثْلَنَا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مِّثْلَنَا معرفہ کی طرف مضاف ہے اور یہ نکرہ ہے تنوین اس میں مقدر ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

یا رُبَّ مِثْلِكِ فِي النِّسَاءِ غَرِيرَةٍ

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا، اراذل، أرذل کی جمع ہے اور أرذل رذل کی جمع ہے(1)۔ جس طرح کلب کی جمع اکلب اور اکلب کی جمع اکالب آتی ہے۔

اور ایک قول کے مطابق اراذل، أرذل کی جمع ہے جس طرح اساود، اسود کی جمع ہے جس کا معنی سانپ ہے اور رذل سے مراد کسی چیز کا گھٹیا حصہ ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی اتباع کرتے ہیں وہ ہم میں سے گھٹیا، حقیر اور رسوا لوگ ہیں۔ زجاج نے کہا: انہوں نے انہیں پیشہ کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ پیشوں کا دیانت میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نحاس نے کہا: اراذل سے مراد وہ فقراء اور وہ لوگ ہیں جن کا کوئی حسب نہیں اور گھٹیا پیشہ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ حدیث طیبہ میں ہے: "وہ جولاہے اور حجام ہیں"۔ اور یہ ان کی طرف سے جہالت تھی کیونکہ انہوں نے اللہ کے نبی پر ایسا عیب لگایا جو ان میں نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر تو دلائل و براہین اور آیات کو لانا لازم ہوتا ہے ان پر ہیئتیں اور صورتیں تبدیل کرنا تو لازم نہیں ہوتا اور انہیں تمام لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی گھٹیا آدمی ایمان لے آئے تو اس وجہ سے انہیں کوئی نقص لاحق نہیں ہوتا، کیونکہ ان پر تو ہر اسلام قبول کرنے والے کے اسلام کو قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اراذل سے یہاں مراد فقراء اور ضعفاء ہیں، جس طرح ہرقل نے ابوسفیان کو کہا تھا کہ لوگوں میں سے اشراف اس (نبی) کی پیروی کرتے ہیں یا ضعفاء؟ تو ابوسفیان نے کہا: ان میں سے ضعفاء (ایمان لائے ہیں) تو ہرقل نے کہا: یہی لوگ انبیاء کے پیروکار ہوتے ہیں(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اشراف پر ریاست و حکومت غالب ہوتی ہے اور ان کا اس سے علیحدگی اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، اور غیر کی اطاعت کرنا ان کے لیے ذلت کا باعث ہوتا ہے، جب کہ فقیر ان موانع سے خالی ہوتا ہے، لہٰذا وہ بات کو قبول کرنے اور اطاعت کرنے میں تیزی کرتا ہے، اور یہ اہل

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 465

2۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 4، صفحہ 1787

دنیا کے اکثر حالات ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا گھٹیاپن کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے کہ گھٹیا لوگ وہ ہیں جو بادشاہوں کے آنے کے وقت لہو ولعب کی اصناف کے ذریعے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اور قاضیوں اور بادشاہوں کے دروازوں پر حاضری کے لیے آتے ہیں۔ ثعلب نے ابن اعرابی سے نقل کرتے ہوئے کہا: گھٹیا لوگوں سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دین کے ذریعے دنیا حاصل کرتا ہے، انہیں کہا گیا کہ پھر گھٹیا ترین کون ہوا؟ تو انہوں نے کہا: وہ آدمی جو اپنے دین کی بربادی کے ذریعے کسی کی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گھٹیاپن کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان سے مراد ایسے لوگ ہیں کہ جو اگر اکٹھے ہو جائیں تو غالب آ جائیں اور اگر جدا جدا ہوں تو پہچانے بھی نہ جائیں۔ حضرت مالک بن انس سے ان کے بارے میں پوچھا گیا کہ گھٹیا لوگ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: جو صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ارذلون سے مراد جولا ہے اور حجام ہیں۔ یحییٰ بن اکثم نے کہا: ان سے مراد ایسے غیر عرب لوگ ہیں جو کھالیں رنگ کرتے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب عورت اپنے شوہر کو یا سفلہ کہے اور مرد اسے کہے: اگر میں ان میں سے ہوں تو تجھے طلاق۔ نقاش نے بیان کیا کہ ایک آدمی امام ترمذی کے پاس آیا اس نے کہا: میری بیوی نے مجھے یا سفلہ کہا ہے تو میں نے اسے کہا: اگر میں سفلہ ہوں تو تجھے طلاق، امام ترمذی نے کہا: تیرا پیشہ کون سا ہے؟ اس نے کہا: مچھیرا، تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم سفلہ۔ میں (قرطبی) نے کہا کہ جس طرح حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے اس طرح تو اسے طلاق واقع نہیں ہو گی، اسی طرح امام مالک اور ابن اعرابی کے قول کے مطابق بھی اسے کوئی چیز واقع نہیں ہو گی۔

قولہ تعالیٰ: بَادِیَ الرَّاْیِ اس سے مراد رائے کا ظاہر ہے اور ان کا باطن اس کے خلاف ہے

جب کوئی چیز ظاہر ہو تو اس وقت بدا یبدو کہا جاتا ہے۔ جس طرح کسی نے کہا:

فالیوم حین بَدَوْن للنُّظّار

صحرا کو بھی ظاہر ہونے کی وجہ سے بادیۃ کہا جاتا ہے اور بدالی ان أفعل کذا کا مطلب ہوتا ہے کہ میرے لیے پہلی رائے کے علاوہ رائے ظاہر ہوئی ہے۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی رائے میں سے جو کچھ ہمارے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ ہے۔ ہو سکتا ہے بادی الرای، بدأ یبدأ سے مشتق ہو اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہو۔ ابو عمرو نے ہمزہ کو ثابت کرتے ہوئے بادئ الرای پڑھا ہے یعنی پہلی رائے، یعنی وہ لوگ تیری پیروی کرتے ہیں جب وہ پہلی نظر سے تمہیں دیکھتے ہیں، اگر انہوں نے گہری نظر و فکر سے کام لیا ہوتا تو وہ تیری اتباع نہ کرتے، یہاں پھر ہمزہ کے ساتھ اور ہمزہ کے بغیر معنی میں کوئی فرق نہیں اور اس کی نصب ی کے حذف کی وجہ سے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) وَ مَا نَرٰی لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی اس کی اتباع میں اور یہ ان کی طرف سے آپ کی نبوت کا انکار ہے۔ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ یہ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ان کا خطاب ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

”آپ نے فرمایا: اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کر دی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآنحالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اور اے میری قوم! میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی مال۔ نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور میں (تمہیں خوش کرنے کے لیے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں کہ ہرگز نہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ کچھ بھلائی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کر دوں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے“۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ یعنی یقین پر، یہ ابو عمران جونی کا قول ہے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ معجزہ پر سورۂ انعام میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ رحمت سے مراد نبوت و رسالت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ (نبوت و رسالت) مخلوق پر رحمت ہے۔

اور ایک قول کے مطابق رحمت سے مراد دلائل کے ساتھ اللہ کی طرف ہدایت دینا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایمان اور اسلام ہے (2)۔ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ یعنی رسالت اور ہدایت تم سے پوشیدہ ہو گئی ہو اور تم اسے نہ سمجھ سکے ہو۔ عمیت عن کذا اور عمی علی کذا کہا جاتا ہے یعنی میں اسے نہ سمجھ سکا۔ اور معنی رحمت کا پوشیدہ ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ قلب سے کیونکہ رحمت پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے پوشیدہ یا اندھا ہو جاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کا قول ادخلت فی القلنسوۃ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466-465 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 466

راسی یعنی میں نے ٹوپی میں اپنا سر داخل کیا اور موزا میرے پاؤں میں داخل ہوا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے اسے فعمیت عین کے ضمہ اور میم کی شد کے ساتھ مجہول پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے اوپر پوشیدہ کر دیا۔ ابی کی قراءت بھی اسی طرح ہے۔ فعماھا اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا ایک قول کے مطابق اس دعوت سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ہا ضمیر رحمت کی طرف راجع ہے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ بینتکی طرف راجع ہے، یعنی کیا ہم اس کو قبول کرنے پر تمہیں مجبور کریں اور اس کو تمہارے اوپر لازم کریں؟ یہ استفہام انکار ہے۔ یعنی مجھے اس بات پر قدرت نہیں دی گئی کہ میں تمہیں اس کی معرفت پر مجبور کروں۔ اس قول کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی تردید کرنے کا قصد فرمایا ہے۔ کسائی اور فراء نے اسے أنُلْزِمْكُمُوها پہلی میم کے سکون کے ساتھ حکایت کیا ہے اور سیبویہ نے ایسا جائز قرار دیا ہے۔ اس نے شعر پڑھا:

فالیوم اَشربْ غیرَ مستحقبٍ إثماً مِنَ اللهِ ولا واغِلِ

نحاس نے کہا: حضرت یونس علیہ السلام کے قول کے مطابق قرآن کے علاوہ انلزمکمھا بھی جائز ہے مضمر کو مظہر کی جگہ رکھتے ہوئے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں انلزمکم ذالك، وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ یعنی تمہارا اسے ناپسند کرتے ہوئے قبول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام استطاعت رکھتے ہوتے تو ضرور اسے اپنی قوم پر لازم کرتے، لیکن وہ اس کے مالک نہ تھے۔

دعوت اور اس پر ایمان لانے پر اجر یعنی "مالاً" مال (کا تم سے سوال نہیں کرتا) کہ تم پر بوجھ کا سبب بنے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ یعنی تبلیغ رسالت میں میرا ثواب اللہ کے ذمہ کرم میں ہے۔ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا انہوں نے آپ کو کہا کہ آپ ان گھٹیا لوگوں کو نکال دیں جو آپ پر ایمان لائے، جس طرح قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ غلاموں اور فقیروں کو نکال دیں۔ جس طرح سورۃ الانعام میں اس کا بیان گزر چکا، تو آپ نے ان کو اپنے اس قول کے ساتھ جواب دیا: وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کو عظیم قرار دیتے ہوئے یہ کہا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی وجہ الاختصام (بطور جھگڑا) یہ کہا۔ یعنی اگر میں ایسا کروں تو وہ اللہ کے ہاں میرے ساتھ جھگڑیں گے پس وہ ان کو ان کے ایمان پر جزا دے گا اور وہ اسے بھی جزا دے گا جس نے ان کو نکال دیا۔

وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ ان کو گھٹیا سمجھنے میں اور ان کے نکال دینے کا مطالبہ کرنے میں میں نے تمہیں جاہل قوم سمجھا (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ فراء نے کہا: یعنی جو اس کے عذاب کو مجھ سے رد کے گا۔ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ یعنی ان کے ایمان کی وجہ سے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تا کو ذال میں مدغم کیا گیا۔ اس کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی عاجزی اور

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 467

تواضع کی خبر دی اور جو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ان کے پاس نہیں اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اور یہ اللہ کا انعام ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اور یہ کہ وہ غیب نہیں جانتے کیونکہ غیب کو وہ نہیں جانتے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ یعنی میں نہیں کہتا کہ لوگوں کے ہاں میرا مقام فرشتوں جیسا ہے اور علماء نے کہا: کلام میں اس بات پر دلالت ہے کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں اطاعت میں ان کے دوام اور قیامت تک ان کی عبادت کے اتصال کی وجہ سے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ سورۃ البقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ یعنی جن کو تمہاری آنکھیں بوجھ سمجھتی ہیں اور حقیر جانتی ہیں اور اصل میں تزدریھم تھا اور میم کو اسم کی طوالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور دال تاء سے بدلی ہوئی ہے کیوں کہ تزدری میں اصل تزتری ہے، مگر ''زا'' کے بعد تا کو دال سے بدل دیا گیا، کیونکہ ''زا'' مجہورہ ہے اور تا مہموسہ پس تا کو اس کے ہم مخرج حرف مجہور کے ساتھ بدل دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: اَزْرَیْتُ علیہ جب تو اس کو عیب لگائے اور زَرَیْتُ علیہ (کہا جاتا ہے) جب تو اس کو حقیر خیال کرے۔ فراء نے شعر پڑھا:

يُبَاعِدُهُ الصديقُ وتَزْدَرِيهِ حَلِيلَتُهُ وَيَنْهَرُهُ الصَّغِيرُ (1)

دوست اس کو دور کرتا ہے اور اس کی بیوی اسے حقیر سمجھتی ہے اور چھوٹا اس کو جھڑکتا ہے۔ (وجہ استشہاد تزدریہ ہے)

لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا یعنی تمہارا ان کو حقیر سمجھنا ان کے اجروں کو باطل نہیں کرتا یا ان کے ثواب کو کم نہیں کرتا، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ، پس وہ ان کو اس پر جزا دے گا اور اس وجہ سے ان کا مواخذہ فرمائے گا (2)۔ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اگر میں وہ کہوں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اِذًا، ملغی عن العمل ہے، کیونکہ یہ درمیان کلام میں ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴ۭ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵ۧ

''وہ (برافروختہ ہو کر) بولے: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور لے آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس اگر چاہے گا اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے۔ اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی، اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ تمہیں گمراہ کر دے، وہ پروردگار ہے تمہارا۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے خود

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 468 2۔ ایضاً

گھڑ لیا ہے اسے؟ آپ فرمایئے: اگر میں نے خود گھڑا اسے تو مجھ پر ہوگا وبال میرے جرم کا۔ اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا یعنی تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور جھگڑے کو طول دیا اور اس میں مبالغہ کیا۔ جدل کلام عرب میں جھگڑے میں مبالغہ کے لیے (استعمال ہوتا) ہے۔ الجدل سے مشتق ہے اور یہ رسی کو مضبوطی سے بنانا (بٹنا) ہے۔ شکرے کو بھی اجدل کہا جاتا ہے اڑنے میں اس کی سختی کی وجہ سے (1)۔ یہ معنی سورۃ الانعام میں اس سے زیادہ واضح طریقے سے گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا پڑھا ہے، نحاس نے اس کو ذکر کیا۔ دین میں جدال کرنا محمود ہے۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے جدال کیا یہاں تک حق غالب ہو جائے پس جس نے اس کو قبول کیا وہ کامیاب اور کامران ہو گیا اور جس نے اس کو رد کیا وہ ناکام اور نامراد ہو گیا اور ناحق جدال کرنا تاکہ باطل کو غلبہ ہو مذموم ہے اور ایسا جدال کرنے والا دنیا و آخرت میں ملامت کیا جاتا ہے۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ یعنی عذاب سے (2)۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اپنے قول میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ یعنی اگر اس نے تمہاری ہلاکت کا ارادہ کیا تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ اس معجزین کا معنی فائتین ہے۔ ایک قول یہ ہے تم اپنی کثرت کی وجہ سے غالب نہیں ہو، کیونکہ وہ اس وجہ سے تکبر کرتے تھے، انہوں نے زمین کے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا تھا جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ یعنی میری تبلیغ اور کوشش تمہارے ایمان میں۔ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ یعنی اس وجہ سے کہ تم اس کو بطور نصیحت قبول نہیں کرتے۔ سورۂ براءۃ میں نصح کا لغوی معنی گزر چکا ہے۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یعنی یہ کہ وہ تمہیں گمراہ کرے، اور یہ معتزلہ قدریہ اور ان کے موافق مذہب رکھنے والے کے مذہب کے بطلان پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی نافرمانی کرنے والا نافرمانی کرے، کفر کرنے والا کفر کرے اور کوئی گمراہ گمراہی کرے اور جو ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ نہیں فرماتا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے ان کی تردید فرما دی کہ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں اور اس کے علاوہ (دیگر سورتوں) میں گزر چکا ہے، اور ان کے شیخ لعین ابلیس نے اپنی گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فبما اغویتنی کے ذریعے کر کے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے ارشاد: اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے تو ان کے لیے کوئی مفر ہی نہیں کہ آپ نے ان کی گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا، کیونکہ وہی ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا ہے جو کچھ منکر اور ظالم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت بڑا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں ہلاک کرے گا، کیونکہ گمراہی ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ طبری نے کہا: اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 166 2۔ ایضاً

ہلاک کرے گا اپنے عذاب کے ذریعے، طبیؔ سے بیان کیا گیا: أصبح فلان غاویا یعنی فلاں مریض ہو گیا اور أغویته سے مراد ہے میں نے اس کو ہلاک کر دیا (1)، اور اسی سے ہے فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (مریم) هُوَ رَبُّكُمْ پس اسی کی طرف سے گمراہی ہے اور اسی کی طرف سے ہدایت وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ اس سے وہ نبی کریم ﷺ کی ذات مراد لیتے ہیں، افتری باب افتعل ہے۔ یعنی اس نے قرآن اپنی طرف سے بنالیا ہے (2)، اور جو اس کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق خبر دی ہے (وہ بھی اپنی طرف سے بنالی ہے) مقاتل نے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے لیے محاورہ ہے۔ اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد صرف حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم ہی کا ذکر ہے، پس خطاب انہی کی طرف سے اور ان کے لیے ہے۔ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ یعنی اگر میں وحی اور رسالت کو (اپنی طرف سے) بنالوں۔

فَعَلَيَّ إِجْرَامِي تو میرے جرم کی سزا مجھ پر ہے اور اگر میں اپنی گفتگو میں سچا ہوں تو تم پر میری تکذیب کی سزا ہو گی۔ الاجرام، اجرم کا مصدر ہے اور اس سے مراد گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہے: میرے جرم اور میرے عمل کی جزا مجھ پر ہے اور جرم اور أجرم کا ایک ہی معنی ہے۔ نحاس اور اس کے علاوہ سے ہے انہوں نے کہا:

طَرِيدُ عَشِيرَةٍ ورهِينُ جُرْمٍ بما جَرَمَتْ يَدِي وَ جَنَى لِسَانِي (3)

جس نے أجرامی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ اس جانب گیا ہے کہ یہ جرم کی جمع ہے، نحاس نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ یعنی کفر اور تکذیب میں سے۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿۳۷﴾

"اور وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے اس لیے آپ غمگین نہ ہوں اس سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔ اور بنائیے ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کیجئے مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا وہ ضرور غرق کر دیئے جائیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ، أَنَّهُ محل رفع میں ہے۔ أُوحِيَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل نصب میں ہو۔ أَنَّهُ اور آمَنَ، يُؤْمِنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوں اور کلام کا مطلب ان کے ایمان سے مایوسی اور ان کے کفر کا دوام چاہنا ہے اور مقصد ان پر وعید کے نزول کو ثابت کرنا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 40
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 46
3۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 167

ضحاک نے کہا: جب (اللہ) نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے ان پر بد دعا (1) کی عرض کیا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿ (نوح) دو آیتیں (تلاوت کیں) اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ ایک قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے آدمی نے اپنے بیٹے کو اپنے کندھے پر اٹھایا۔ بچے نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے باپ سے کہا: مجھے پتھر دو اس نے اس کو پتھر دیا اور اس نے یہ پتھر حضرت نوح علیہ السلام کو مارا تو اس نے آپ کو زخمی کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ۔

فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ یعنی ان کی ہلاکت کی وجہ سے آپ غمگین نہ ہوں یہاں تک کہ آپ غمزدہ نہ ہو جائیں۔ بائس یعنی غمگین ہونے والا اور البوس کا معنی ہے الحزن (2)۔ اسی سے شاعر کا قول ہے۔

وكم من خليل أوحميم رُزِئتُه　　فلم أبتئسْ والرُّزْءُ فيه جَلِيلُ(3)

ابتاس لرجل کہا جاتا ہے جب اس کو کوئی ناپسندیدہ خبر پہنچے اور الابتئاس، عاجزی میں غم کو (کہا جاتا) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا یعنی کشتی بنا تا کہ آپ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے اس میں سوار ہوں۔ بِاَعْيُنِنَا یعنی ہماری طرف سے نگرانی کے ساتھ اور اس طرح کہ ہم تجھے دیکھیں۔ ربیع بن انس نے کہا: ہماری طرف سے تمہاری حفاظت کے ساتھ ایسے شخص کی حفاظت کی طرح جو تجھے دیکھ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہماری حفاظت کے ساتھ، معنی ایک ہی ہے۔ پس رؤیت کو اعین کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ رؤیت اسی کے ساتھ ہوتی ہے (4)۔ اُعین کو جمع ذکر کرنا عظمت کے لیے ہے نہ کہ کثرت کے لیے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿ (المرسلات) فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿ (الذاریات) اور وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿ (الذاریات) (ان تمام میں قادرون، ماہدون اور موسعون کو اظہار عظمت کے لیے جمع ذکر کیا گیا ہے)

اس آیت کریمہ میں اور اس کے علاوہ میں الاعین کا معنی عین کے معنی کی طرف راجع ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿ (طٰہٰ) اور یہ سارے کا سارا عبارت ہے ادراک اور احاطہ کرنے سے اور وہ حواس، تشبیہ اور کیفیت سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ایک قول یہ ہے: بِاَعْيُنِنَا کا معنی ہے یعنی ہمارے ان فرشتوں کی نگرانی میں جن کو ہم نے تمہاری حفاظت اور معاونت (5) پر آنکھوں (کی مثل) بنا دیا ہے۔ اس کثرت کی بنیاد پر جمع اپنے باب پر ہوگی۔ ایک قول یہ ہے بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے علم کے ساتھ، یہ مقاتل نے کہا ہے۔ ضحاک اور سفیان نے کہا: بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے حکم کے ساتھ۔ ایک قول ہے ہماری وحی کے ساتھ، ایک قول ہے اس کے بنانے پر ہماری مدد کے ساتھ تمہارے لیے (6)۔ وَوَحْيِنَا یعنی اس کے بنانے کے لیے جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے مطابق وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ یعنی ان کے لیے مہلت نہ مانگو، میں ان کو غرق کرنے والا ہوں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 469　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470-469　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۞

''اور نوح کشتی بنانے لگے اور جب بھی گزرتے ان کے پاس سے ان کی قوم کے سردار (تو) آپ کا مذاق اڑاتے۔ آپ کہتے: اگر تم مذاق اڑاتے ہو ہمارا تو (ایک روز) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو۔ سو تم جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو رسوا کر دے گا اسے اور (کون ہے) اترتا ہے جس پر عذاب ہمیشہ رہنے والا۔ یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم اور ابل پڑا تنور تو ہم نے (نوح کو) فرمایا: سوار کر لو کشتی میں ہر جنس سے نر و مادہ دو دو اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور (سوار کر لو) جو ایمان لا چکے ہیں اور نہیں ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ مگر تھوڑے لوگ''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ یعنی آپ بنانے لگے۔ زید بن اسلم نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام سو سال درخت لگاتے رہے، ان کو کاٹتے رہے اور خشک کرتے رہے (1)، اور سو سال ان میں کام کرتے رہے (کشتی بناتے رہے) ابن قاسم نے ابن اشرس عن مالک روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: مجھ تک خبر پہنچی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے زمین کو بھر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا، پس وہ (پہاڑ والے) ان (میدان والوں) کی طرف نہیں اتر سکتے تھے اور نہ یہ (میدان والے) ان (پہاڑ والوں) کی طرف چڑھ سکتے تھے، پس حضرت نوح علیہ السلام سو سال کشتی بنانے کے لیے درخت لگاتے رہے، پھر ان کو جمع کیا سو سال تک خشک کرتے رہے اور آپ کی قوم مذاق اڑاتی رہی، اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے آپ کو یہ (کشتی) بناتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے تھا جو کچھ تھا، عمرو بن حارث سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دمشق کے علاقے میں کشتی بنائی اور اس کی لکڑی لبنان کے پہاڑ سے کاٹی۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو نکالا جو مومنین کے اصلاب اور ارحام میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ، فاصنع الفلك آپ نے عرض کیا: اے رب! میں بڑھئی نہیں ہوں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: ہاں بے شک یہ میری نگرانی میں ہوگا آپ نے کلہاڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ کا ہاتھ صحیح صحیح کام کرنے لگا۔ پس انہوں نے آپ کے پاس سے گزرنا شروع کر دیا اور کہتے: یہ ہے وہ جو گمان کرتا ہے کہ یہ نبی ہے،

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470

(اب) بڑھئی بن گیا ہے۔ پس آپ نے اس (کشتی) کا کام چالیس سال میں کیا۔

ثعلبی اور ابونصر قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دو سال میں کشتی بنائی۔ ثعلبی نے (اس میں یہ) اضافہ کیا، اور یہ اس وجہ سے کہ آپ کو پتہ نہ تھا کہ کشتی کیسے بنتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ اس کو پرندے کے سینے کی طرح بناؤ، حضرت کعب نے کہا: آپ نے اس کو تیس سال میں بنایا۔ واللہ اعلم

مہدوی نے کہا: حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ ملائکہ آپ کو سکھاتے تھے کہ آپ اس کو کس طرح بنائیں۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں (علماء نے) اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع، چوڑائی پچاس ذراع اور بلندی تیس ذراع تھی(1) اور یہ ساکھو کی لکڑی سے (بنائی گئی) تھی۔ اور اسی طرح کلبی، قتادہ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع تھی اور ذراع کندھے تک ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کشتی کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع ہے۔ ثعلبی نے اس کو کتاب ''العرائس'' میں بیان کیا ہے۔ علی بن زید نے یوسف بن مہران سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (ان کے) حواریوں نے کہا: اگر آپ ہمارے لیے کسی ایسے آدمی کو اٹھائیں جس نے کشتی کو دیکھا ہو تو وہ ہمارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کرے۔ آپ ان کے ساتھ چل پڑے یہاں تک کہ آپ مٹی کے ایک ڈھیر کے پاس رکے۔ اس مٹی میں سے مٹھی بھر لی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ حام بن نوح کی کہنی ہے۔ انہوں نے کہا: آپ نے اپنا عصا اس ریت کے ٹیلے کو مارا اور فرمایا: اللہ کے اذن سے اٹھ، پس وہ اپنے سر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور وہ بوڑھا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا: کیا تو اسی طرح ہلاک ہوا تھا؟ اس نے کہا: نہیں بلکہ میں مرا تو جوانی کی حالت میں تھا لیکن میں نے سمجھا کہ یہ قیامت ہے پس اس وجہ سے بوڑھا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے بارے میں خبر دے۔ اس نے کہا: اس کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع تھی اور اس کی تین منزلیں تھیں، ایک منزل میں چوپائے اور وحشی جانور، ایک منزل میں انسان اور ایک منزل میں پرندے تھے(2)۔ انہوں نے باقی حدیث کو ذکر کیا جس طرح کہ اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کلبی نے کہا جو اس کو نقاش نے بیان کیا: اس میں چار ذراع پانی داخل ہوا، اس کے تین دروازے تھے، ایک دروازے میں درندے اور پرندے، ایک دروازے میں وحشی جانور اور چوپائے اور ایک دروازے میں مرد اور عورتیں تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تین منزلیں بنائی ہیں۔ نیچے والی منزل وحشی جانوروں، درندوں اور چوپاؤں کے لیے، درمیانی کھانے، پینے کے لیے اور اوپر والی منزل میں آپ خود سوار ہوئے۔ اور اپنے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کو مردوں اور عورتوں کے درمیان چوڑائی کی صورت میں اٹھایا، پھر بعد میں بیت المقدس میں ان کو دفن کر دیا اور شیطان ان کے ساتھ کشتی کے پچھلے حصے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 44

میں تھا۔ کہا گیا: سانپ اور بچھو کشتی میں داخل ہونے کے لیے آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں تم دونوں کو سوار نہیں کروں گا، کیونکہ تم دونوں نقصان اور مصیبت کا سبب ہو، تو انہوں نے کہا: ہمیں سوار کر لیجئے، ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں کہ ہم کسی بھی ایسے شخص کو نقصان نہیں دیں گے جو آپ کو یاد کرے گا۔ پس جس نے بھی ان سے نقصان کے خوف کے وقت سلام علی نوح فی العالمین پڑھا تو انہوں نے اسے کوئی نقصان نہ دیا۔ قشیری اور ان کے علاوہ نے اس کو ذکر کیا۔ حافظ ابن عساکر (1) نے اپنی تاریخ میں حضرت ابی امامہ کی حدیث سے مرفوعاً ذکر کیا انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے شام کے وقت صَلَّى اللهُ عَلَى نُوْحٍ وَعَلَى نُوْحٍ السَّلَامُ کہا تو اس رات بچھو اس کو نہیں ڈسے گا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد كُلَّمَا ظرف ہے۔ مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ اخفش اور کسائی نے کہا کہ سخرت بہ و منہ کہا جاتا ہے (یعنی سخر کا صلہ ب اور من دونوں ہو سکتے ہیں) اور ان (کفار) کے مذاق کے بارے میں دو قول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آپ کو خشکی میں کشتی بناتے ہوئے دیکھتے تھے تو آپ کا تمسخر اڑاتے اور استہزا کرتے تھے اور کہتے: اے نوح! تو نبوت کے بعد بڑھئی بن گیا۔ دوسرا۔ جب انہوں نے آپ کو کشتی بناتے ہوئے دیکھا جب کہ اس سے قبل انہوں نے کشتی بنتی نہیں دیکھی تھی تو انہوں نے کہا: اے نوح! تو کیا بنا رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا، تو وہ آپ کی بات سے حیران ہوئے اور آپ کا تمسخر اڑایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: طوفان (نوح) سے پہلے زمین پر کوئی نہر اور دریا نہیں تھا پس اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا، اور دریاؤں کا پانی یہ طوفان کا ہی باقی ماندہ ہے۔ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا یعنی جس نے کشتی بناتے وقت آج ہمارے ساتھ (مذاق) کیا۔ فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ کل غرق کے وقت (ہم تم سے مذاق کریں گے) اور یہاں مذاق سے مراد حقیر سمجھنا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم ہمیں حقیر سمجھو گے تو ہم تمہیں حقیر سمجھیں گے جس طرح تم ہمیں حقیر سمجھتے ہو (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ (یہ) دھمکی (ہے) اور مَنْ، سوف تعلمون کی وجہ سے متصل ہے۔ تَعْلَمُوْنَ یہاں متعدی ہے۔ یعنی فسوف تعلمون الذی یاتیہ العذاب، تم جان لو گے اس عذاب کو جو آئے گا، یہ بھی جائز ہے کہ من استفہامیہ ہو، یعنی ہم میں سے کس پر وہ عذاب آتا ہے؟ ایک قول یہ ہے: من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور یاتیہ خبر ہے اور یخزیہ عذاب کی صفت ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ اہل حجاز میں سے کچھ لوگ سوف تعلمون کہتے ہیں اور انہوں (کسائی) نے کہا کہ جس نے ستعلمون کہا ہے اس نے واؤ اور فا دونوں کو ساقط کر دیا ہے۔ کوفیوں نے سَفَ تعلمون بیان کیا ہے، اور بصری سوائے سوف تفعل اور ستفعل کے (کوئی اور صورت) نہیں جانتے یہ دو لغتیں ہیں ان میں سے ایک دوسری میں سے نہیں۔ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ یعنی (کون ہے) جس پر ثابت ہوتا ہے اور اترتا ہے عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی ہمیشہ رہنے والا مراد آخرت کا عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ علماء (کا) تنور کے بارے میں اختلاف ہے (اس کے بارے میں) سات اقوال ہیں۔

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق لابن العساکر، جلد 62، صفحہ 256
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 471

پہلا: کہ یہ زمین کی اوپر والی سطح ہے(1)، عرب زمین کی اوپر والی سطح کو تنور کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، زہری اور ابن عیینہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ آپ (حضرت نوح علیہ السلام) کو کہا گیا: جب آپ زمین کی سطح پر پانی دیکھیں تو آپ اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ سوار ہو جائیں۔

دوسرا: یہ وہ روٹی والا تنور ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے یہ تنور پتھر سے (بنا) ہوتا تھا اور یہ حضرت حواء کا تھا یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہو گیا آپ کو کہا گیا: جب آپ پانی کو تنور سے ابلتا ہوا دیکھیں تو آپ اور آپ کے اصحاب (دوست) سوار ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے تنور سے پانی کو جاری فرمایا، پس آپ کی بیوی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا: اے نوح علیہ السلام! پانی تنور سے ابل پڑا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میرے رب کا وعدہ آ گیا جو کہ سچا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے، مجاہد اور عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بیان کیا ہے۔

تیسرا: یہ کشتی میں پانی جمع ہونے کی جگہ تھی، حسن رضی اللہ عنہ سے بھی (یہی منقول ہے)۔

چوتھا: یہ فجر کا طلوع ہونا اور صبح کی روشنی ہے، ان (عربوں) کے اس قول سے نور الفجر تنویرا یعنی فجر روشن ہو گئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا ہے۔

پانچواں: یہ کوفہ کی مسجد ہے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے یہ مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تنور کی سمت کوفہ میں تھی، انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے کوفہ کی مسجد کے درمیان میں کشتی بنائی اور تنور باب کندہ سے متصل اندر دائیں جانب تھا اور اس سے پانی کا نکلنا حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ان کی قوم کی ہلاکت کی نشانی اور دلیل تھی۔ شاعر نے کہا جو کہ امیہ ہے:

فار تنورُھم جاش بماءٍ صار فوق الجبالِ حتّٰی علاھا(2)

ان کا تنور ابل پڑا اور پانی کے ذریعے جوش میں آ گیا۔ تو آپ (حضرت نوح علیہ السلام) پہاڑوں کے اوپر ہو گئے یہاں تک کہ آپ ان پر چڑھ گئے۔

چھٹا: یہ زمین کی بلندی ہے اور زمین میں سے بلند مقامات (کو تنور کہا جاتا ہے) یہ قتادہ کا قول ہے۔

ساتواں: یہ وہ چشمہ ہے جو "عین الوردة" کے جزیرہ میں ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ حضرت آدم علیہ السلام کا (تنور) چشمہ تھا اور یہ شام کے ایک مقام پر تھا جس کو "عین الوردة" کہا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کا تنور ہند میں ابل پڑا(3)۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں کوئی تناقض نہیں، کیونکہ اللہ نے ہمیں خبر دی ہے کہ پانی آسمان اور زمین (دونوں) سے آیا (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ (القمر) پس ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے موسلادھار بارش سے۔ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (القمر: 12) اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔

پس یہ سارے اقوال اس بات کو جامع ہیں کہ یہ (تنور کا ابلنا عذاب کی) علامت تھا۔ فوران سے مراد ابلنا، جوش کھانا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 171　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472　3۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 343

ہے، تنور عجمی نام ہے جس کو عربوں نے عربی بنالیا ہے اور یہ فعّل کے وزن پر ہے، کیونکہ اس کی بنا کی اصل تنّد ہے اور کلام عرب میں راسے پہلے نون نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے فار التنور کا معنی عذاب کے آجانے کے لیے بطور تمثیل ہے جس طرح عربوں کا قول حمی الوطیس (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب جنگ سخت ہو جائے۔ الوطیس سے مراد التنور ہے، کہا جاتا ہے: فارت قدر القوم (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب ان کی جنگ سخت ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

ترکتم قِدْرَکم لاشئ فیها وقِدْرُ القوم حامیةٌ تَفُورُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی مذکر اور مونث، (مرد اور عورت) طوفان کے بعد نسل کی اصل کو باقی رکھنے کے لیے۔ حفص نے من کلٍّ زوجین اثنین پڑھا ہے۔ کل کی تنوین کے ساتھ یعنی ہر چیز میں سے جوڑا جوڑا۔ دونوں قراءتیں ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتی ہیں (یعنی) ایک چیز جس کے ساتھ دوسری ایسی چیز ہو جس سے وہ مستغنی نہ ہو ایسی دو چیزوں کے بارے میں "هما زوجان" کہا جاتا ہے۔ جس میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی سے مستغنی نہ ہو پس ان دونوں میں سے ہر ایک کو زوج کہتے ہیں، کہا جاتا ہے لہ زوجا نعل جب اس کے پاس دو جوتے ہوں، اور اسی طرح (کہا جاتا ہے) "عندہ زوجا حمام" اس کے پاس دو حمام ہیں اور علیہ زوجا قیود اس پر دو قیود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ۝ (النجم) اس نے جوڑا یعنی مذکر اور مونث کو پیدا فرمایا۔

عورت کو کہا جاتا ہے: یہ مرد کا زوج ہے جب کہ مرد کو کہا جاتا ہے: یہ اس (عورت) کا زوج ہے۔ اور بعض اوقات دو کے بارے میں کہا جاتا ہے: هما زوج یعنی وہ دونوں زوج ہیں اور بعض اوقات زوجین بمعنی ضربین اور صنفین ہوتا ہے اور ہر قسم کو زوج کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ (الحج) یعنی ہر رنگ اور صنف میں سے۔ اعشیٰ نے کہا:

وکل زوجٍ من الدِّیباجِ یَلبَسه أبو قُدامة محبوٌّ بذاك مَعاً

اس نے ہر قسم اور رنگ مراد لیا، مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ، احْمِلْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اثْنَيْنِ (اس کی) تاکید ہے۔ وَ اَهْلَكَ یعنی اور آپ اپنے گھر والوں کو سوار کریں۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ، مَنْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ان میں سے یعنی ہلاکت کا، اور وہ آپ کا بیٹا کنعان اور آپ کی بیوی واعلۃ ہے جو دونوں کافر تھے۔ وَ مَنْ اٰمَنَ۔ ضحاک اور ابن جریج نے کہا: یعنی تو سوار کر اس کو جو مجھ پر ایمان لایا یعنی جس نے آپ کی تصدیق کی۔ پس منا، احمل کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے اسی انسان ایمان لائے (1)۔ ان میں سے تین آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث تھے اور تین ان کی بیویاں تھیں، جب وہ کشتی سے نکلے تو انہوں نے ایک گاؤں بنایا، وہ آج بھی موصل کے نواح میں "قریۃ الثمانین" اسی اشخاص کا گاؤں کہلاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کشتی میں آٹھ آدمی تھے، حضرت نوح علیہ السلام آپ کی بیوی۔ سزا یافتہ بیوی کے علاوہ، آپ کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں۔ یہ قتادہ، حکم بن عتیبہ، ابن جریج

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472

اور محمد بن کعب کا قول ہے: حام نے کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کر لیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کے نطفے کو تبدیل کر دے تو اس نے سیاہ رنگ والے کو جنم دیا(1)۔

عطا نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے حام کے خلاف دعا کی کہ اس کی اولاد کے بال ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھیں اور یہ کہ وہ جہاں ہوں اس کی اولاد سام اور یافث کی اولاد کی غلام ہو کر رہے۔ اعمش نے کہا: وہ سات تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، تین ان کے بیٹوں کی بیویاں اور تین بیٹے، انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کو ساقط کر دیا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: ان کی عورتوں کے علاوہ وہ دس تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث چھ آدمی ان لوگوں میں سے جو آپ پر ایمان لائے تھے اور ان سب کی بیویاں اور قَلِيْلٌ، اٰمَنَ (کا فاعل ہونے) کی وجہ سے مرفوع ہے۔ استثناء کی وجہ سے اس کو نصب دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے پہلے کلام مکمل نہیں ہوتا، مگر یہ کہ ''الا'' اور ''ما'' کے دخول میں فائدہ ہے کیونکہ آپ کہیں آپ کے ساتھ فلاں فلاں ایمان لایا تو ممکن ہے ان کے علاوہ بھی ایمان لائے ہوں اور جب آپ ''الا'' اور ''ما'' لگاتے ہیں تو جو ''الا'' کے بعد ہیں وہ ثابت ہو جائیں گے اور ان کے علاوہ کی نفی ہو جائے گی۔

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۴۱ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ࣙابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۲ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝۴۳ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴

''اور نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں، اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے۔ بے شک میرا پروردگار غفور رحیم ہے۔ اور وہ چلنے لگی انہیں لے کر ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اور وہ (ان سے) الگ تھا۔ بیٹا سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ اور نہ ملو کافروں کے ساتھ۔ بیٹے نے کہا: (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں پناہ لے لوں گا کسی پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے۔ آپ نے کہا: (بیٹا!) آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مگر جس پر وہ رحم کرے اور (اسی اثنا میں) حائل ہو گئی ان کے درمیان موج پس ہو گیا وہ ڈوبنے والوں سے اور حکم دیا گیا: اے زمین! نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان! تھم جا۔ اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا اور ٹھہر گئی کشتی جودی (پہاڑ) پر اور کہا گیا: ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لیے''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 473

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا سوار ہونے کا حکم ہے۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کو ہو۔ رکوب کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی پشت پر بلند ہونا۔ کہا جاتا ہے: رکبه الدين دین اس پر سوار ہوا۔ اور کلام میں حذف ہے یعنی ارکبوا الماء فی السفینۃ کشتی میں پانی پر سوار ہو جاؤ۔ ایک قول یہ ہے (اس کا) معنی "ارکبوھا" ہے یعنی اس پر سوار ہو جا۔ اور فی تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۞ (یوسف) (لِلرُّءْيَا میں لام تبیین کے لیے ہے) اور فی کا فائدہ یہ ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ کشتی کے پیٹ میں (اندر) ہو جائیں نہ کہ اس کی پشت پر۔ عکرمہ نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی دس محرم کو جودی (پہاڑ) پر رکی۔ تو یہ چھ ماہ ہیں، یہ قول قتادہ نے کیا اور اس نے (اس بات کا) اضافہ کیا اور وہ یوم عاشورہ ہے۔ پس آپ (نوح) نے اپنے ساتھیوں کو کہا: جو روزہ دار ہے وہ اپنا روزہ پورا کرے اور جو روزہ دار نہیں وہ روزہ رکھے (1)۔ طبری نے اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام رجب کی یکم کو کشتی میں سوار ہوئے اور پورا مہینہ روزہ رکھا کشتی یوم عاشورہ تک ان کو لے کر چلی اور اس (یوم عاشورہ) (2) میں جودی (پہاڑ) پر رکی، تو حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے اس دن کا روزہ رکھا۔

طبری نے ابن اسحاق سے جو ذکر کیا ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ پانی پر ایک سال تک مقیم رہے، کشتی بیت اللہ کے پاس سے گزری تو اس نے اس کے سات چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس (بیت اللہ) کو غرق نہ ہونے دیا۔ پھر کشتی یمن کی طرف گئی اور جودی (پہاڑ) کی طرف واپس ہوئی پس اس پر ٹھہر گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اہل حرمین اور اہل بصرہ نے ان دونوں کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا سوائے اس آدمی کے جو جدا ہو گیا، اس معنی پر کہ اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔ پس مَجْرٖىهَا اور مُرْسٰىهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو (اس صورت میں) تقدیر عبارت ہوگی: اللہ کے نام سے اس کے چلنے کا وقت ہے۔ پھر وقت کو حذف کر دیا گیا اور مَجْرٖىهَا کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے "بسم اللہ مجریھا" میم کے فتحہ کے ساتھ اور مرساھا میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یحییٰ بن عیسیٰ نے اعمش عن یحییٰ بن وثاب بسم اللہ مجراھا و مرساھا دونوں میں میم کے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس بنیاد پر کہ یہ مصدر ہے جرت تجری جریا و مجری اور رست رسوا و مرسی سے جب وہ لنگر انداز ہو جائے۔ مجاہد، سلمان بن جندب، عاصم جحدری اور ابو رجاء نے "بسم اللہ مجریھا و مرسیھا" پڑھا ہے اللہ عزوجل کی صفت کے طور پر محل جر میں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا مضمر ہونے کی بنیاد پر یعنی ھو مجریھا و مرسیھا حال ہونے کی وجہ سے بھی نصب جائز ہے۔ ضحاک نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام جب بسم اللہ مجراھا کہتے تو وہ چل پڑتی اور جب بسم اللہ مرساھا کہتے تو وہ رک جاتی۔ مروان بن سالم نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے حضرت حسین بن علی سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 473
2۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 58-57

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے لیے غرق سے امان ہے جب وہ کشتی پر سوار ہوں (اور یہ پڑھیں) اللہ کے نام سے جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے(1)۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (الزمر) بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ہود) اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے۔

اس آیت میں ہر کام کی ابتداء کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ کے ذکر پر دلیل ہے، جیسا کہ ہم (قرطبی) نے اس کو بِسْمِ اللّٰهِ میں بیان کر دیا۔ والحمدللہ۔

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی کشتی والوں کو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب گوبر اور گندگی زیادہ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ ہاتھی کی دم کو ہاتھ سے ٹٹولو۔ تو اس سے خنزیر اور خنزیرہ گرے تو وہ دونوں گوبر کی طرف آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اگر میں اس خنزیر کی دم ٹٹولوں: پس آپ نے ایسا کیا تو اس سے چوہا اور چوہیا نکلے جب وہ دونوں گرے تو کشتی اور اس کی رسی کی طرف آئے۔ اس (چوہیا) نے اس کو کاٹا اور اس نے سامان اور زادراہ کو کاٹا یہاں تک کہ ان (کشتی والوں) کو کشتی کی رسیوں کے بارے میں خطرہ لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ شیر کی پیشانی پر ہاتھ پھیر دو تو آپ نے اس کو ہاتھ پھیرا، تو اس سے دو بلیاں نکلیں انہوں نے چوہیا کو کھالیا۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے شیر کو کشتی میں سوار کیا تو عرض کیا: اے رب! میں اس کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں عنقریب اس کو مشغول کر دوں گا۔ تو اس کو بخار نے آلیا تو وہ سارا زمانہ (ہمیشہ) بخار زدہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بہائم میں سے سب سے پہلے جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے سوار کیا وہ بطخ ہے جب کہ جس کو سب سے آخر میں سوار کیا وہ گدھا ہے۔ انہوں نے کہا: شیطان اس (گدھے) کی دم سے لٹک گیا۔ اور اس (گدھے) کی اگلی ٹانگیں کشتی میں داخل ہو چکی تھیں جب کہ پچھلی ٹانگیں باہر تھیں، تو گدھا اچھلنے لگا اور داخل نہ ہو سکا، حضرت نوح علیہ السلام نے بلند آواز سے کہا: داخل ہو، تیرے لیے ہلاکت ہو، تو وہ اچھلنے لگا، آپ نے فرمایا: داخل ہو تیرے لیے ہلاکت ہو، اگرچہ تیرے ساتھ شیطان ہی کیوں نہ ہو، یہ کلمہ غلطی سے آپ کی زبان پر جاری ہوگیا۔ (گدھا) داخل ہوا اور شیطان جھپٹا اور داخل ہوگیا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی میں گانے گاتے ہوئے دیکھا تو اس کو کہا: اے لعنتی! تجھے میرے گھر میں کس نے داخل کر دیا؟ اس نے کہا: آپ نے مجھے اجازت دی اس نے (واقعہ) آپ کے سامنے ذکر کیا، آپ نے اس کو فرمایا: اٹھ نکل جا۔ اس نے کہا: آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ اٹھائیں۔ پس ان کے گمان کے مطابق وہ کشتی کی پشت پر تھا۔

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 220

حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پتھر کے دو چمک دار نگینے تھے۔ ایک سورج کی جگہ اور دوسرا چاند کی جگہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے ایک دن کی سفیدی کی طرح سفید تھا اور دوسرا رات کی سیاہی کی طرح سیاہ تھا۔ آپ ان کے ذریعے نماز کے اوقات کو پہچانتے تھے۔ جب شام ہوتی اس کی سیاہی دوسرے کی سفیدی پر غالب آجاتی اور جب وہ صبح کرتے تو اس کی سفیدی دوسرے کی سیاہی پر غالب آجاتی اوقات کے حساب سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ، مَوْجٍ، موجة کی جمع، اس سے مراد وہ (لہریں ہیں) جو ہوا کی شدت کے وقت زیادہ پانی سے اٹھتی ہیں۔ کاف تشبیہ کے لیے ہے۔ یہ موج کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ تفسیر میں آیا ہے کہ پانی ہر چیز سے پندرہ ذراع تجاوز کر گیا۔ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ ایک قول ہے: وہ کافر تھا اور اس کا نام کنعان تھا، ایک قول ہے: یام۔ سیبویہ کے قول کے مطابق وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ لفظوں میں ابنہ سے واؤ کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے اور اس نے شعر پڑھا:

لَهُ زَجَلٌ كَأَنَّهُ صَوْتُ حَادٍ

اور جہاں تک وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ کا تعلق ہے تو یہ قراءت شاذہ ہے یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ ابو حاتم نے گمان کیا کہ یہ جائز ہے اس بنیاد پر کہ اس سے ان کی مراد ابنہا ہے۔ الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح آپ ابنہ کہتے ہیں۔ پس آپ واؤ کو حذف کر دیتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اور یہ جو ابو حاتم نے کہا ہے یہ سیبویہ کے مذہب کے مطابق درست نہیں کیونکہ الف خفیف ہے اس کو حذف کرنا جائز نہیں جب کہ واؤ ثقیل ہے اس کا حذف کرنا جائز ہے۔ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ یعنی اپنے باپ کے دین سے۔ ایک قول ہے: کشتی سے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پتہ نہ تھا کہ ان کا بیٹا کافر ہے جب کہ ان کا گمان تھا کہ وہ مومن ہے، اسی وجہ سے آپ نے اسے فرمایا: وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ اس کا بیان آئے گا۔ یہ ندا قوم کو غرق ہونے کے یقین اور ناامیدی کی صورت سے پہلے تھی، بلکہ یہ تنور کے پھوٹنے اور حضرت نوح علیہ السلام کے لیے علامت کے ظاہر ہونے کے آغاز میں تھی۔ عاصم نے يَا بُنَيَّ ارْكَبْ مَعَنَا یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اس کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا بنی کی اصل یہ ہے کہ یہ تین یا کے ساتھ ہو۔ یا تصغیر، یا فعل اور یا اضافت۔ یا تصغیر کو فعل کے لام کلمہ میں مدغم کر دیا گیا، یا اضافت کی وجہ سے فعل کے لام کلمہ کو کسرہ دیا گیا اور یا اضافت کو تنوین کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا، یا اس کے اور را کے ساکن ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ یہ یا کی کسرہ کے قراءت کی اصل ہے اور یہی (اس جگہ پر) فتح کی قراءت کی اصل بھی ہے، کیونکہ یا اضافت کو الف کے خفیف ہونے کی وجہ سے الف کے ساتھ بدل دیا گیا پھر الف کے حذف ہونے والے حرف کے عوض میں آنے کے سبب یا الف اور را کے ساکن ہونے کے سبب حذف کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: جہاں تک عاصم کی قراءت کا تعلق ہے تو یہ مشکل ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس سے مراد یا بنیاہ ہے پھر الف اور ہا کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ ان کا نقطۂ نظر اس کے عدم جواز کا تھا، کیونکہ الف خفیف ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: مجھے معلوم نہیں کہ نحویوں میں سے سوائے ابو اسحاق کے کسی نے اس کلام کو جائز

قرار دیا ہو۔ پس اس نے یہ گمان کیا ہے کہ فتحہ دو جہتوں سے ہے اور کسرہ بھی دو جہتوں سے ہے۔ پس فتحہ اس صورت میں (ہوگا) کہ وہ یا کو الف سے بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا: یاویلتا جس طرح کہ شاعر نے کہا:

فیاعجبًا من رَحلها المتحمَّلِ

پس وہ یا بنیتا مراد لیتے ہی پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا، جس طرح آپ کہتے ہیں: جاء عبداللہ تثنیہ کے بارے میں۔

اور دوسری جہت یہ ہے کہ الف کو حذف کر دیا جائے کیونکہ نداء مقام حذف ہوتا ہے۔ اور کسرہ اس بنیاد پر ہوگا کہ ندا کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا جائے اور دوسری جہت یہ ہے کہ اس کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ سَاٰوِیۡۤ یعنی میں لوٹ جاؤں گا اور مل جاؤں گا۔ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ یعنی وہ مجھے بچالے گا۔ مِنَ الۡمَآءِ پس میں غرق نہیں ہوں گا۔ قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ یعنی کوئی بچانے والا نہیں، پس یہ دن وہ ہے جس میں کفار پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ عاصم منصوب ہوگا۔

یہ بھی جائز ہے کہ ”لاعاصم الیوم میں لا بمعنی لیس“ ہو۔ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ یہ محل نصب میں ہے پہلے سے استثنا ہے، یعنی لیکن اللہ تعالیٰ جس پر رحم فرمائے پس وہ اس کو بچالے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اس بنیاد پر کہ عاصم بمعنی معصوم ہو، جس طرح ماء دافق میں دافق بمعنی مدفوق ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہوگی، شاعر نے کہا:

بطئُ القیامِ رخیمُ الکلامِ أَمسَی فؤادِی بہ فَاتِنَا

اس میں فاتن بمعنی مفتون ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

دَعِ المکارِمَ لا تَنۡهَضۡ لبغیتها واقعدۡ فإنَّكَ أنتَ الطاعِمُ الکَاسِی

یعنی ”المطعوم المکسو“۔ نحاس نے کہا: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ من محل رفع میں ہے، معنی ہوگا۔ آج اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے رحم فرمانے والے کے یعنی سوائے اللہ کے، یہ طبری کا اختیار کردہ (موقف) ہے (1)۔ اور یہ عمدہ ہے اس اعتبار سے کہ آپ کو نہ تو عاصم بمعنی معصوم کرنا پڑے گا (2) کہ آپ اس کو اس کے باب سے ہی خارج کر دیں اور نہ ہی الا بمعنی لکن کرنا پڑے گا۔

وَ حَالَ بَیۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان (3)۔ فَکَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ کہا گیا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار تھا تو اس نے اپنی شخصیت پر غرور کیا اور اس کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو گیا، جب اس نے دیکھا کہ پانی آ گیا ہے تو اس نے کہا: اے میرے باپ! تنور ابل پڑا، تو اس کے باپ نے اسے کہا: اے بیٹے! سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ، وہ واپس نہ لوٹا تھا کہ ایک بڑی موج آئی تو اس نے اس کو اور اس کے گھوڑے کو نگل لیا اور وہ اس کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان حائل ہو گئی پس وہ غرق ہو گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے لیے شیشے کا ایک ایسا گھر بنایا تھا جس میں پانی (کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 55 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 175 3۔ ایضاً

عذاب) سے اس نے پناہ لینی تھی۔ پس جب تنور ابلا تو وہ اس میں داخل ہو گیا اور اندر سے اس کو تالا لگا دیا اس میں غوطے کھاتا رہا اور پیشاب کرتا رہا یہاں تک کہ اسی کے سبب غرق ہو گیا۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ پہاڑ جس کی اس نے پناہ لی تھی وہ طور سیناء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ یہ مجاز ہے کیونکہ وہ (زمین، آسمان) موات (جن میں زندگی نہ ہو) ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ان میں وہ قوت رکھ دی گئی ہے جس کے ذریعے امتیاز ہو سکتا ہے اور جس نے کہا کہ یہ مجاز ہے اس نے کہا ہے: اگر عرب وعجم کے کلام کو تلاش کر کے اس میں غور وفکر کیا جائے تو اس آیت کا حسن نظم اس کی بلاغت اور اس میں موجود معانی کے حوالے سے کوئی کلام اس کا مثل نہیں ہے۔

حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ زمین کو سال یا دو سال میں بارش سے خالی نہیں چھوڑتا اور اس نے آسمان سے کبھی بھی پانی نازل نہیں فرمایا مگر ایک ایسے فرشتے کی حفاظت میں جو اس کا ذمہ دار ہوتا ہے سوائے طوفان (نوح) کے پانی کے کہ یہ آسمان سے بغیر کسی فرشتے کی حفاظت کے نازل ہوا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ (الحاقہ) کشتی ان کو لے کر چلی یہاں تک کہ (کفار کی ہلاکت اور مومنین کی نجات) کا امر پورا ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے موسلا دھار بارش کے پانی کو رکنے اور زمین کو پانی نگلنے کا کلمہ ارشاد فرمایا، کہا جاتا ہے: بلع الماء يبلعه، منع يمنع باب سے اور بلع، يبلع، حمد، يحمد باب سے یہ دو لغتیں ہیں جو کسائی اور فراء نے بیان کیا۔ اور ایسی جگہ جو پانی پیتی ہو اس کو بالوعة کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: دونوں پانی جو زمین میں تھا اور جو آسمان سے نازل ہوا، جمع ہو گئے اس امر کی وجہ سے جو مقدر کر دیا گیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اترنے والے پانی کو تھمنے کا حکم دیا، اس میں سے زمین نے ایک قطرہ بھی جذب نہ کیا اور زمین کو صرف وہی پانی نگلنے کا حکم دیا جو اس سے نکلا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی جدا جدا فرمائے پس جو زمین کا پانی تھا تو اس کو حکم دیا کہ تو اس کو نگل جا اور آسمان کا پانی دریا (سمندر) بن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَغِيْضَ الْمَآءُ یعنی وہ کم ہو گیا، کہا جاتا ہے: غاض الشئ وغضته أنا جس طرح کہا جاتا ہے: نقص بنفسه و نقصه غيره کہ وہ خود بخود کم ہو گیا اور کسی اور نے اسے کم کر دیا۔ اس کو غیض غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی صحیح ہے۔ وقضی الأمر یعنی ان نے مضبوطی سے کیا اور اس سے فارغ ہو گیا۔ یعنی اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو مکمل طور پر اور مضبوطی سے ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عورتوں کے رحموں کو غرق سے چالیس سال پہلے بانجھ کر دیا تھا، پس جو ہلاک ہوئے ان میں کوئی چھوٹا نہ تھا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے طوفان کے ذریعے بچوں کو بھی ہلاک کیا جس طرح پرندے اور درندے ہلاک ہوئے، اور یہ غرق بچوں، جانوروں اور پرندوں کے لیے بطور سزا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنی طبعی موت کے سبب مرے۔ حکایت بیان کی گئی ہے کہ جب گلیوں میں پانی زیادہ ہو گیا تو ایک بچے کی ماں بچے کے بارے میں ڈر گئی، وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی، وہ اس کو لے کر پہاڑ کی طرف نکلی حتی کہ پہاڑ کے تیسرے حصے تک پہنچ گئی جب پانی وہاں پہنچا، وہ نکلی حتی کہ اس کے دو تہائی تک پہنچ گئی، جب پانی وہاں پہنچا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی، جب پانی اس کی گردن تک

پہنچا تو اس نے اپنے بچے کو ہاتھ پر اوپر اٹھالیا حتی کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو اس بچے کی ماں پر رحم فرماتا (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ان کے لیے ہلاکت ہے۔ جودی، موصل کے قریب ایک پہاڑ ہے، اس پر وہ (کشتی) محرم کی دس یعنی یوم عاشورہ کو رکی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے سب ساتھیوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لوگوں، وحشی جانوروں، پرندوں، چوپاؤں اور ان کے علاوہ نے بھی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: وہ دن جمعہ کا تھا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی طرف وحی فرمائی کہ کشتی ان میں سے کسی ایک پر رکے گی تو انہوں نے تکبر کیا، اور جودی باقی بچ گیا جس نے تکبر نہ کیا اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتے ہوئے تو کشتی اس پر رکی اور اسی پر اس کی لکڑیاں باقی رہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اس (کشتی) کی کوئی چیز باقی رہ گئی جس کو اس امت کے ابتدائی لوگوں نے پایا ہے"۔ مجاہد نے کہا: پہاڑ بلند ہوئے اور انہوں نے تکبر کیا تا کہ غرق ان کو نہ پہنچ سکے، پس پانی ان سے پندرہ ذراع بلند ہو گیا اور جودی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے خشوع وخضوع اختیار کیا تو وہ غرق نہ ہوا اور کشتی اس پر رک گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ جودی ہر پہاڑ کا نام ہے۔ اسی سے زید بن عمرو بن نفیل کا قول ہے:

سُبحانه ثم سُبحاناً يَعودُ لَهُ　　و قَبْلَنا سَبَّحَ الجُودِيُّ والجَمَدُ (2)

کہا جاتا ہے کہ جودی جنت کے پہاڑوں میں سے ہے اس لیے وہ (کشتی) اس پر رکی، کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے تین آدمیوں کی وجہ سے تین پہاڑوں کو عزت بخشی، جودی کو حضرت نوح علیہ السلام، طور سینا کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حرا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے۔

مسئلہ: جب جودی نے تواضع اور خضوع اختیار کیا (تو اللہ تعالیٰ نے) اسے عزت دے دی اور جب اس کے علاوہ (دیگر پہاڑ) بلند ہوئے اور انہوں نے بلندی کو چاہا تو اس نے انہیں ذلت دی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے اپنی مخلوق کے بارے میں، وہ اٹھاتا ہے جو خشوع کرے اور گراتا ہے جو بلندی چاہے۔ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

وإذا تذلّلتِ الرّقابُ تَخشُّعًا　　مِنّا إليكَ فعِزُّها في ذُلِّها

"اور جب ہم میں سے لوگوں نے ڈرتے ہوئے تیری بارگاہ میں تذلل اختیار کیا تو ان (لوگوں) کی عزت ان کے تذلل میں ہے"۔

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (3) انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا، اس سے سبقت نہ لی جاسکتی تھی، ایک اعرابی اپنی سواری پر آیا تو وہ اس سے سبقت لے گیا تو مسلمانوں کو

1۔ تاریخ مدینہ دمشق، جلد 62، صفحہ 254
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 474
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، ناقة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 402

اس سے بہت زیادہ رنج ہوا۔ انہوں نے کہا: عضباء پیچھے رہ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے اپنے او پر یہ لازم کر لیا ہے کہ جس چیز کو دنیا میں سر بلند کرتا ہے اس کو (ایک بار) سرنگوں بھی کرتا ہے''۔

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی (1) جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا اور معافی مانگنے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ کرتا ہے اور جو شخص بھی اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سر بلند کرتا ہے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (2): ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تم تواضع کرو حتی کہ کوئی شخص دوسرے پر ظلم نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے''۔ اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ۔ اس میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کا ان کی قوم کے ساتھ واقعہ ذکر کریں گے اور کشتی کا کچھ ذکر کریں گے۔ حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا** (العنکبوت: 14) اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ایک ہزار سال ٹھہرے مگر پچاس سال۔

اور ان میں گناہ گار اور جابر لوگ بہت زیادہ تھے اور انہوں نے بہت زیادہ تکبر کیا، حضرت نوح علیہ السلام ان کو رات، دن مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر دعوت دیتے رہے، آپ بہت زیادہ صبر کرنے والے بردبار تھے، انبیاء میں سے کسی پر اتنی سختیاں نہیں آئیں جتنی کہ حضرت نوح علیہ السلام پر آئیں۔ وہ لوگ آپ کے پاس آتے تو آپ کا گلہ دباتے یہاں تک کہ ادھ موا کر کے چھوڑتے، مجالس میں وہ آپ کو مارتے اور مجالس سے باہر نکال دیتے، آپ ایسا کرنے والے پر بددعا نہ فرماتے بلکہ ان کے لیے دعا کرتے اور کہتے: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ یہ چیز ان پر کسی قسم کا اضافہ نہ کرتی سوائے ان (حضرت نوح علیہ السلام) سے فرار کے حتیٰ کہ اگر آپ ان میں سے کسی آدمی سے گفتگو کرتے تو وہ اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتا اور اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتا تا کہ وہ آپ کے کلام میں سے کچھ بھی نہ سن سکے۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد (دلالت کرتا) ہے۔ **وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ** (نوح: 7) اور میں جب بھی انہیں دعوت دیتا ہوں تا کہ تو انہیں معاف کر دے تو وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں (3)۔

مجاہد اور عبید بن عمیر نے کہا: وہ آپ کو مارتے حتی کہ آپ پر غشی طاری ہوتی جب آپ کو افاقہ ہوتا تو آپ کہتے: اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کو مارا جاتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب فی البر والصلۃ والادب، استحباب العفو، جلد 2، صفحہ 321

2۔ صحیح مسلم، کتاب فی کتاب الجنۃ، الصفات التی یعرف بھا الدنیا اھل الجنۃ واھل النار، جلد 2، صفحہ 385

3۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 244

پھر کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا اور آپ کو اپنے گھر میں پھینک دیا جاتا وہ (یہ) خیال کرتے کہ آپ فوت ہو گئے ہیں پھر آپ نکلتے اور ان کو دعوت دیتے، حتی کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ ایک آدمی آپ کے پاس آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا وہ شخص عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھا، اس آدمی نے کہا: اے میرے بیٹے! دیکھ یہ شیخ تمہیں دھوکہ نہ دے، اس (بیٹے نے) کہا: اے باپ! عصا مجھے دیجئے، اس نے اس کو عصا دیا اس (لڑکے) نے عصا لیا پھر کہا: مجھے زمین پر چھوڑ دو اس کے (باپ) نے اسے چھوڑ دیا وہ عصا کے ساتھ آپ کی طرف چلا تو اس نے آپ کو مارا اور آپ کے سر میں موضحہ (جس میں سر کی ہڈی ظاہر ہو جاتی ہے) زخم لگایا اور خون بہنے لگا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اے رب! تو دیکھ رہا ہے جو تیرے بندے میرے ساتھ کرتے ہیں پس اگر تیرے بندوں میں تیرے لیے کوئی بہتری ہے تو توان کو ہدایت نصیب فرما اور اگر (ان میں) اس کے علاوہ ہو تو تو مجھے صبر دے یہاں تک کہ تو فیصلہ فرمائے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اس حال میں کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ مردوں کی صلبوں میں اور عورتوں کے رحموں میں کوئی مومن باقی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ یعنی آپ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا آپ نے عرض کی: اے رب! لکڑی کہاں (سے لوں)؟ فرمایا: درخت لگا۔ کہا: بیس سال آپ نے ساکھو کا درخت لگایا، دعوت دینے سے رک گئے اور وہ استہزا سے رک گئے حالانکہ وہ آپ کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، جب درخت نے اپنے رب کے امر کو پالیا تو آپ نے اسے کاٹا اور خشک کیا۔ عرض کیا: اے رب! میں اس گھر کو کیسے بناؤں؟ اللہ نے فرمایا: اس کو تین صورتوں پر بناؤ، اس کا سر مرغ کے سر کی طرح، اس کا سینہ پرندے کے سینہ کی طرح اور اس کی دم مرغ کی دم کی طرح بناؤ۔ اور اس کی منزلیں بناؤ اور ان کے پہلوؤں میں ان منزل کے لیے دروازے رکھو اور آپ نے اس کو میخوں کے ساتھ مضبوط کیا۔ دسر سے مراد لوہے کے کیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا تو اس نے آپ کو کشتی بنانا سکھائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کا گھر دمشق میں تھا آپ نے اپنی کشتی لبنان کی لکڑی سے زمزم، رکن (یمانی) اور مقام (ملتزم) کے درمیان بنائی۔ جب مکمل ہو گئی تو اس میں درندے اور چوپائے پہلے دروازے میں سوار کیے۔ وحشی جانور اور پرندے دوسرے دروازے میں سوار کیے اور ان دونوں کے دروازے بند کر دیئے۔ اور اولاد آدم، چالیس مرد اور چالیس عورتوں کو سب سے اوپر والے دروازے میں سوار کیا اور ان پر دروازہ بند کر دیا اور چھوٹی چیونٹیوں کو ان کے کمزور ہونے کی وجہ سے سب سے اوپر والے دروازے میں اپنے ساتھ سوار کیا تا کہ چوپائے ان کو روند نہ ڈالیں (1)۔

زہری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا پس اس نے درندے، پرندے، وحشی جانور اور چوپاؤں میں ہر جوڑے کو کشتی میں سوار کر دیا۔ جعفر بن محمد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا اس نے ان کو جمع کر دیا، پھر جبریل نے جوڑے پر اپنے ہاتھ پھیرے۔ اس کا دایاں ہاتھ مذکر پر اور بایاں مونث پر ہوتا۔ پس ان کو اس نے کشتی میں داخل کر دیا۔ حضرت زید بن ثابت

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 248

نے کہا: ماعزہ (وہ بھیڑ جو بغیر دم اور لاٹ کے ہوتی ہے) کا کشتی میں داخل کرنا حضرت نوح علیہ السلام پر مشکل ہوگیا تو آپ نے اس کی دم میں ہاتھ ڈال کر اس کو دھکیلا، اسی وجہ سے اس کی دم ٹوٹ گئی تو وہ مڑی ہوئی ہوگئی اور اس کا حیا (دبر اور فرج) ظاہر ہوگیا۔ نعجة (لاٹ یا چکی والی بھیڑ) چلی گئی حتی کہ داخل ہوگئی تو آپ نے اس کی دم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا حیا (دبر اور فرج) مستور ہوگیا۔ اسحاق نے کہا: ہمیں ایک اہل علم نے خبر دی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی والوں کو سوار کیا اور اس ہر چیز کا جوڑا جوڑا رکھا تو ہدہد کا بھی جوڑا سوار کیا، ہدہدۃ (مونث) زمین ظاہر ہونے سے پہلے ہی کشتی میں مرگئی۔ ہدہد نے اس کو اٹھالیا، اس کو لے کر دنیا کا چکر لگایا تاکہ اس کے لیے جگہ پالے لیکن اس نے کوئی مٹی وغیرہ نہ پائی، تو اس کے رب نے اس پر رحم فرمایا اس کے لیے اس (نر) کی گدی میں قبر کھود دی تو اس نے اسے اس میں دفن کرلیا، پس ہدہد کی گدی میں اگنے والے بال قبر کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے ہدہد کی گدی ابھری ہوئی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت نوح علیہ السلام (1) نے کشتی میں اپنے ساتھ تمام درخت لادے اور عجوۃ (کا درخت) جنت میں سے کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تھا''۔ صاحب کتاب ''العروس'' وغیرہ نے ذکر کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب چاہا کہ زمین کے بارے میں خبر لانے کے لیے وہ کسی کو بھیجیں تو مرغ نے کہا: میں (لاؤں گا) آپ نے اس کو پکڑا اور اس کے پر پر مہر لگادی اور اس کو کہا: تو میری مہر کی وجہ سے مختومہ ہے تو کبھی بھی نہیں اڑ سکے گا۔ تجھ سے میری امت نفع اٹھائے گی۔ آپ نے کوے کو بھیجا تو اس نے مردار پالیا تو اس پر بیٹھ گیا اور دیر کردی تو آپ نے اس پر لعنت کی، اسی وجہ سے حل وحرم میں اس کو قتل کردیا جاتا ہے اور آپ نے اس کے خلاف خوف کی بددعا کی، اسی وجہ سے یہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ کبوتری کو بھیجا تو اس نے قرار نہ پایا، سیناء کی زمین میں ایک درخت پر بیٹھی اور زیتون کے درخت کا پتہ اٹھالیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ آئی تو آپ جان گئے کہ یہ زمین میں قرار حاصل نہیں کرسکے گی۔ پھر اس کو اس کے بعد بھیجا، یہ اڑی یہاں تک کہ حرم کی وادی میں پہنچ گئی تو کعبہ کے مقامات سے پانی جذب ہوچکا تھا اور اس کی مٹی سرخ تھی، وہ اس کی ٹانگوں میں لگ گئی پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئی اور کہا: میرے لیے آپ کی طرف سے خوشخبری ہے کہ آپ نے مجھے میری گردن میں طوق ہبہ کردیا اور میری ٹانگ میں خضاب اور میں حرم میں رہوں گی۔ تو آپ نے اس کی گردن اور طوق پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اس کی ٹانگوں میں اس کو سرخی ہبہ کردیا اور اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے برکت کی دعا کی۔

ثعلبی نے ذکر کیا کہ آپ نے کوے کے تدارج کو بھیجا اور یہ مرغ کی جنس میں سے تھا۔ اس کو کہا: معذرت کرنے سے بچنا، تو اس نے شادابی اور فراخی کو پالیا۔ اور واپس نہ لوٹا اور اپنی اولاد کو قیامت تک آپ کے پاس رہن رکھ دیا۔

وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ

1۔ تاریخ مدینہ دمشق، جلد 62، صفحہ 261

مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کی: اے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میری اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں پس نہ سوال کیا کرو مجھ سے جس کا تجھے علم نہ ہو میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نہ ہو جانا نادانوں سے۔ عرض کرنے لگے: میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ میں سوال کروں تجھ سے ایسی چیز کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں ہو جاؤں گا زیاں کاروں سے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ یعنی اس نے اس (اللہ) سے دعا کی۔ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ یعنی میرے ان اہل میں سے جن کے غرق سے نجات کا تو نے وعدہ فرمایا ہوا ہے، پس کلام میں حذف ہے۔ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ یعنی سچا۔ ہمارے علماء نے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاَهْلَكَ کی وجہ سے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کو ترک کر دیا۔ جب ان کے نزدیک وہ انکے اہل سے تھا تو عرض کیا: رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ اس بات پر ان کا قول وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ دلالت کرتا ہے، یعنی تو ان میں سے نہ ہو جا جن سے تو نہیں ہے، کیونکہ وہ آپ کے گمان کے مطابق مومن تھا اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے رب کو اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ کہنے والے نہیں تھے مگر وہ ان کے نزدیک ایسا ہی تھا، کیونکہ یہ تو محال ہے کہ آپ کفار کی ہلاکت کا سوال کریں پھر ان میں سے بعض کی نجات کا بھی سوال کریں، آپ کا بیٹا کفر کو چھپاتا اور ایمان کو ظاہر کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی جو علم غیب میں سے اس کے ساتھ خاص تھی یعنی میں تمہارے بیٹے کی حالت کو جانتا ہوں جو تو نہیں جانتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ منافق تھا اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے لیے دعا مانگنے کو جائز سمجھا۔ اور ان ہی سے روایت ہے: یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا، اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے کہ ونادی نوح ابنھا وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے یعنی تو نے ایک قوم کی نجات اور ایک قوم کے غرق کا حکم فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یعنی یہ تیرے ان اہل میں سے نہیں جن کی نجات کا میں نے ان سے وعدہ فرمایا، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ جمہور نے کہا: یہ تیرے دین اور نہ ہی تیری ولایت کا اہل ہے(1)، تو یہ (ترجمہ) مضاف کے حذف کی صورت میں ہوگا (یعنی اہل دینك وولایتك) اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476

دین میں متفق ہونے کا حکم نسب کے حکم کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ حضرت ابن عباس، حضرت عروہ، عکرمہ، یعقوب اور کسائی نے اس کو ''انه عَمِلَ غَیْرَ صالح'' پڑھا ہے۔ یعنی کفر اور تکذیب وغیرہ۔ ابوعبید نے اسی کو اختیار کیا ہے اور باقی لوگوں نے عَمَلٌ پڑھا ہے یعنی تیرا بیٹا غیر صالح عمل والا ہے ابنک ذو عمل غیر صالح مضاف کو حذف کر دیا گیا، یہ زجاج اور دیگر کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

تَرْتَعُ مَا رَتَعَتْ حَتّٰی اِذَا ادَّکَرَتْ فَاِنَّمَا هِیَ اِقْبَالٌ وَ اِدْبَارٌ(1)

یعنی ذات اقبال و ادبار، یہ قول اور جو اس سے قبل ہے ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ انکی ضمیر سوال کے لیے ہو یعنی بے شک تیرا مجھ سے اس کی نجات کا سوال کرنا عمل غیر صالح ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عمل غیر صالح کا معنی یہ ہے کہ یہ پیدا آپ کے فراش میں ہوا، حالانکہ آپ کا بیٹا نہیں، اور یہ ناجائز شادی کا تھا، مجاہد کا بھی یہی قول ہے(2)۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ میں نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! وہ ان کا بیٹا نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ تو انہوں (حسن) نے کہا: آپ (نوح) نے ''منی'' نہیں کہا اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا کسی اور خاوند سے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت نوح علیہ السلام سے حکایت کیا کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ، وَنَادٰی نُوْحُ ۨابْنَهٗ اور اہل کتاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ان کا بیٹا تھا، تو حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: کون شخص اہل کتاب سے اپنا دین لیتا ہے، وہ تو جھوٹے ہیں اور انہوں نے پڑھا فخانتاھما (کہ ان دونوں نے خیانت کی)

ابن جریج نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو بلایا اور ان کا گمان یہ تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے اور وہ آپ کے فراش پر پیدا ہوا اور اس معاملے میں ان کی بیوی نے ان کے ساتھ خیانت کی۔ اسی وجہ سے فرمایا: فخانتاھما۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا(3): کسی نبی کی بیوی نے کبھی بھی بغاوت (بدکاری) نہیں کی، وہ آپ کا اصلی بیٹا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر کو کہا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ کیا وہ آپ کے اہل سے تھا؟ کیا وہ آپ کا صلبی بیٹا تھا؟ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی لمبی تسبیح کی پھر فرمایا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام فرماتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا ہے، اور تو کہتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا نہیں۔ ہاں وہ ان کا بیٹا تھا، لیکن وہ نیت، عمل اور دین میں مخالف تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ قول کرنے والے کی جلالت کی وجہ سے اس باب میں زیادہ صحیح ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ یہ ان اقوال میں سے نہیں جن کے ذریعے اس کے ان کا بیٹا ہونے کی نفی کی جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فخانتاھما یعنی دین میں (خیانت کی) نہ کہ فراش میں، اور یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو بتاتی تھی کہ یہ مجنون ہے، اور اس وجہ سے کہ اس نے آپ کو کہا: کیا تیرا رب تیری مدد کرے گا؟ آپ نے اسے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: کب؟ آپ نے فرمایا جب تنور ابل پڑے گا، تو وہ اپنی قوم کو یہ کہتے ہوئے نکل کھڑی ہوئی: اے قوم! اللہ کی قسم یہ مجنون ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 177
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 62

یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا رب اس تنور کے ابل پڑنے سے اس کی مدد کرے گا۔ پس یہ اس کی خیانت ہے اور دوسری خیانت یہ ہے کہ وہ مہمانوں کے خلاف رہنمائی کرتی تھی جس طرح کہ عنقریب آئے گا اگر اللہ نے چاہا تو۔ واللہ اعلم۔ ایک قول یہ ہے ولد بعض اوقات عمل کو بھی کہتے ہیں جس طرح کہ کسب کو کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تمہاری اولاد تمہارے کسب سے ہے''(1)۔ قشیری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں مخلوق کو ان کی اولادوں کے فساد کے بارے میں تسلی دینا (مقصود) ہے اگرچہ وہ (خود) نیکوکار ہی کیوں نہ ہوں۔ روایت ہے کہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ اوپر سے اترے اور آپ کے پاس ایک حمام تھا جس نے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ راوی نے کہا کہ حضرت مالک کو پتہ چل گیا کہ لوگ اس کو سمجھ گئے ہیں، تو حضرت مالک نے کہا: ادب اللہ کا ادب ہے نہ کہ والدین کا ادب اور بھلائی اللہ کی بھلائی ہے نہ کہ آباء اور امہات کی بھلائی۔

اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ بیٹا اہل اور اہل بیت میں سے ہے لغوی اور شرعی طور پر، پس جس نے اپنے اہل کے لیے وصیت کی تو اس میں اس کا بیٹا بھی داخل ہوگا اور وہ بھی داخل ہوگا جس کو اس کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے ہو، اس حال میں کہ وہ اس کے عیال میں ہو۔ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ (الصافات) فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ (الانبیاء) وہ تمام لوگ جن کو ان کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کا اہل فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حسن، مجاہد اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچہ فراش کے لیے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جو کچھ کہا فراش کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبید بن عمیر کو کہتے ہوئے سنا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی وجہ سے فیصلہ فرمایا کہ بچہ فراش کے لیے ہے(2)، اس کو ابو عمر نے کتاب ''التمہید'' میں ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بچہ فراش کے لیے ہے اور زانی کے لیے حجر ہے''۔ حجر سے مراد نا کامی و نامرادی ہے، اور کہا گیا: (اس سے مراد) پتھر سے رجم کرنا ہے۔ عروۃ بن زبیر نے پڑھا۔ ونادی نوح ابنھا اس سے مراد آپ (نوح) کی بیوی کا بیٹا ہے، اور یہ آپ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی گزشتہ قراءت کی تفسیر ہے۔

اور یہ حسن اور مجاہد کے لیے حجت ہے مگر یہ قراءت شاذہ ہے اس کی وجہ سے ہم متفق علیہ قراءت کو ترک نہیں کریں گے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ یعنی میں تجھے اس سوال سے روکتا ہوں اور تم کو ڈراتا ہوں کہ تم نہ ہو جاؤ (جاہلین میں سے) یا (اس بات کو) ناپسند کرتے ہوئے کہ آپ ہو جائیں جاہلین یعنی گناہ گاروں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، ما جاء ان الوالد یأخذ من مال ولدہ، جلد 1، صفحہ 162

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، الولد للفراش، جلد 1، صفحہ 471

میں سے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا (النور: 17) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ڈراتا ہے اور روکتا ہے۔ کہا گیا: معنی یہ ہے کہ میں تمہیں اس بات سے بلند کردوں گا کہ تو جاہلین میں سے ہو(1)۔

ابن عربی نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ اور نصیحت ہے جس کے ذریعے وہ حضرت نوح علیہ السلام کو جاہلین کے مقام سے اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے ان کو علماء اور عارفین کے مقام پر بلند فرماتا ہے۔ پس حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ اور یہ انبیاء کے ذنوب ہیں۔ تو آپ نے اپنے تذلل اور تواضع کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کیا۔ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ جو سوال کی وجہ سے زیادتی ہو۔ تَرْحَمْنِیْۤ یعنی توبہ کے ذریعے۔ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ یعنی از روئے اعمال کے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

''ارشاد ہوا اے نوح! (کشتی سے) اتریئے امن و سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو آپ پر ہیں اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں اور (آئندہ) کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں پھر پہنچے گا انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی آپ کو فرشتوں نے کہا، یا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کشتی سے زمین کی طرف اتریئے یا پہاڑ سے زمین کی طرف (اتریے) پس اس نے پانی کو نگل لیا اور خشک ہوگئی۔ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی سلامتی اور امن کے ساتھ۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سلام ہے وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ یعنی ثابت شدہ نعمتیں۔ یہ بروك الجمل سے مشتق ہے اور یہ اس کا ثابت ہونا اور اس کا قائم ہونا ہے۔ اور اسی سے البركة (حوض) ہے اس میں پانی کے ٹھہرنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام آدم اصغر ہیں، اب ساری مخلوق آپ کی نسل میں سے ہے۔ قتادہ وغیرہ کے قول کے مطابق کشتی میں مردوں اور عورتوں میں آپ کے ساتھ سوائے آپ کی اولاد کے کوئی سوار نہ تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تنزیل میں وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ۝ (الصافات) ہے۔ اور ہم نے ان کی اولاد کو بنایا کہ وہی باقی رہنے والے ہیں۔ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں۔ کہا گیا ہے: اس میں قیامت تک (آنے والا) ہر مومن داخل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ میں قیامت تک (آنے والا) ہر کافر داخل ہے(2)، یہ محمد بن کعب سے روایت کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر تقدیر عبارت یہ ہوگی، وعلی ذریة امم معك وذریة امم سنمتعهم، وامم کو اس وجہ سے رفع دیا گیا کہ اس کا معنی ہے وتكون امم۔ اخفش سعید نے کہا کہ جس طرح تم کہتے ہو كلمت زيدا وعمرو جالس میں نے زید سے کلام کیا اور عمر بیٹھنے والا ہے۔ فراء نے غیر قراءت میں واممًا پڑھنے کی اجازت دی اور اس کی تقدیر ہوگی: ونمتع اُمَمًا اور علی کو اُمم کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا کیونکہ عَلَیْكَ کی کاف ضمیر پر اس کا عطف ہے اور ضمیر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 67

مجرور ہے اور سیبویہ وغیرہ کے قول کے مطابق ضمیر مجرور پر حرف جار کے اعادہ کے بغیر عطف نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء: 1) وَالْاَرْحَامَ کے جر کے ساتھ اس کا بیان مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بسلام میں با محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ حال کی جگہ ہے یعنی اهبط مسلما علیك اور منا محل جر میں محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ برکات کی صفت ہے۔ وعلی امم اسی کے متعلق ہے جس کے متعلق علیك ہے کیونکہ کاف پر عطف کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مِّمَّنْ مَّعَكَ میں من محذوف کے متعلق ہے کیونکہ یہ محل جر میں اُمم کی صفت ہے اور معك فعل محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ من کا صلہ ہے یعنی فمن استقر معك (جو آپ کے ساتھ ٹھہرا) یا آمن معك (جو آپ پر ایمان لایا) یا رکب معك (جو آپ کے ساتھ سوار ہوا)

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

''یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم وحی کر رہے ہیں آپ کی طرف نہ آپ جانتے تھے اسے اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے پس آپ صبر کریں یقیناً نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ یعنی جو خبریں، اور ایک اور مقام پر ذالك ہے یعنی خبروں میں سے وہ خبریں اور قصص جو آپ سے غیب ہیں (1)۔ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ یعنی تاکہ آپ ان سے آگاہ ہو جائیں۔ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ یعنی وہ طوفان کے معاملہ سے ناواقف تھے حالانکہ مجوسی اب اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد ان کا حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قصے سے ناواقف ہونا ہے اگرچہ من جملہ انہوں نے طوفان کا معاملہ سن رکھا ہے۔ فَاصْبِرْ صبر کر رسالت کی مشقتوں اور قوم کی اذیتوں پر جس طرح نوح علیہ السلام نے صبر کیا، یعنی اے محمد! اللہ کے امر اور اپنی رسالت کی تبلیغ کے ذریعے قیام پر صبر کیجئے اور جو عرب کفار کی طرف سے آپ کو اذیت ملتی ہے اس پر اس طرح صبر کیجئے جس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر صبر کیا۔

اِنَّ الْعَاقِبَةَ دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی (کا انجام) لِلْمُتَّقِيْنَ شرک اور گناہوں سے (بچنے والوں کے لیے ہے)۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 179

اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ
رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا
تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾ وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا
بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا
لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

"اور عاد کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی ہود کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا معبود اس کے سوا، نہیں تم مگر افترا پرداز۔ اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت، نہیں ہے میری اجرت مگر اس (ذات پاک) کے ذمہ جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ کیا تم (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے؟ اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے اور نہ منہ موڑو (اللہ تعالیٰ سے) جرم کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا: اے ہود! نہیں لے آیا تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے خداؤں کو تمہارے کہنے سے اور نہیں ہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ جتلا کر دیا ہے تجھے ہمارے کسی خدا نے دماغی خلل میں۔ ہود نے کہا: میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس کے سوا، پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے، پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تمہاری طرف اور جانشین بنا دے گا میرا رب کسی اور قوم کو تمہارے علاوہ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ بوجہ اپنی رحمت کے اور ہم نے نجات دے دی انہیں سخت عذاب سے۔ اور یہ قوم عاد (کی داستان) ہے انہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی اور پیروی کرتے رہے ہر متکبر منکر حق کے حکم کی اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی۔ سنو! عاد

نے انکار کیا اپنے رب کا، سنو! ہلاکت و بربادی ہو عاد کے لیے جو ہود کی قوم تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی اور ہم نے بھیجا۔ اَرْسَلْنَا نُوْحًا پر اس کا عطف ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان (قوم عاد) کا بھائی کہا گیا ان میں سے ہونے کی وجہ سے، قبیلہ نے ان کو جمع کر دیا تھا، جس طرح آپ کہتے ہیں: یا اخا تمیمہ ایک قول یہ ہے ان کو ان کا بھائی کہا گیا کیونکہ وہ (ہود علیہ السلام) اولاد آدم علیہ السلام سے ہیں جس طرح کہ وہ (قوم عاد) اولاد آدم سے ہے۔ یہ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور وہ بتوں کے پجاری تھے۔ کہا گیا ہے: عاد (نام کی) دو (قومیں) تھیں عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ۔ تو یہ عاد اولیٰ ہے، رہے عاد ثانیہ تو وہ شداد اور لقمان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ارم ذات العماد میں مذکور ہیں۔ عاد ایک آدمی کا نام ہے پھر اس کی طرف منسوب ایک قوم پر اس کا اطلاق ہوا۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔ غیرہ لفظاً مجرور اور غیرہ محلاً مرفوع اور غیرہ استثنا کی بنیاد پر منصوب اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ یعنی تم غیر کو معبود بنانے میں اس (اللہ تعالیٰ عزوجل) پر جھوٹ بولنے والے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ اور فطرت (سے مراد) مخلوق کی ابتدا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اس کو جو قوم نوح پر جاری ہوا جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ سورت کی ابتداء میں یہ گزر چکا ہے۔ یُرْسِلِ السَّمَآءَ، یرسل مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب ہے اور اس میں جزا کا معنی ہے۔ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا مدرارا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس میں کثرت کا معنی ہے، یعنی آسمان موسلا دھار بارش برسائے گا(1)۔ اور عرب مفعال میں نسب کی صورت میں ہا کو حذف کر دیتے ہیں۔

اکثر اوقات مفعال کا وزن افعل باب افعال سے آتا ہے جب کہ یہاں فعل سے آیا ہے کیونکہ یہ درّت السماء تدِر اور تدُر سے مشتق ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم یعنی قوم عاد باغوں، کھیتوں اور عمارتوں والی قوم تھی اور ان کی رہائش گاہیں شام اور یمن کے درمیان والے ٹیلے تھے جس طرح کہ سورۂ اعراف میں گزر گیا۔

وَّیَزِدْكُمْ یرسل پر اس کا عطف ہے۔ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ مجاہد نے کہا: (قوت سے مراد) شدت ہے۔ ضحاک نے کہا: شادابی، علی بن عیسیٰ کے نزدیک: عزت۔ اور عکرمہ کے نزدیک: اولاد ہے(2)۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال ان سے بارش روک لی اور رحموں کو بانجھ کر دیا پس ان کا کوئی بچہ پیدا نہ ہوا، تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہارے شہروں کو زندہ (آباد) کر دے گا اور تمہیں مال اور اولاد عطا فرمائے گا۔ پس یہی قوت ہے۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہے کہ وہ قوت کا اضافہ فرما دے گا نعمتوں میں۔ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ یعنی تم اس سے اعراض نہ کرو جس کی طرف میں تم کو دعوت دیتا ہوں اور کفر پر قائم نہ ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ یعنی واضح حجت۔ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ان کی طرف سے کفر پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 477 2۔ ایضاً

اصرار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ یعنی تجھے مبتلا کر دیا ہے۔ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا اس سے مراد بت ہیں۔ بِسُوْٓءٍ یعنی جنون نے آپ کا ان کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہ مروی ہے، کہا جاتا ہے: عراہ الامر و اعتراہ جب کوئی اس میں مبتلا ہو جائے۔ اور اسی سے ہے: وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج: 36)

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ یعنی اپنی ذات پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ وَاشْهَدُوْٓا یعنی میں تم کو گواہ بناتا ہوں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ اہل شہادت میں سے تھے بلکہ یہ تقریر کی انتہا ہے، یعنی اس لیے کہ تم پہچان لو۔ اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ یعنی ان بتوں کی پوجا سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا یعنی تم اور تمہارے بت میری دشمنی اور مجھے نقصان دینے میں مکر کریں۔ ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ یعنی تم مجھے مہلت نہ دو۔ دشمنوں کی کثرت کے باوجود یہ قول اللہ تعالیٰ کی مدد پر کامل بھروسہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ نبوت کی علامات میں سے ہے کہ رسول اکیلا اپنی قوم کو کہتا ہے: فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو کہا اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ الایۃ (یونس: 71) تم اپنا معاملہ اور اپنے شرکاء کو جمع کر لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ یعنی میں اس کے حکم پر راضی ہوں اور اس کی مدد کے بارے میں پر امید ہوں۔ مَا مِنْ دَآبَّةٍ یعنی وہ نفس جو زمین پر رینگتا ہے۔ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکو گے. ہر وہ چیز جس میں روح ہو اس کو داب یا دابۃ کہا جاتا ہے اور اس دابۃ میں ہا مبالغہ کے لیے ہے۔ فراء نے کہا: (اس سے مراد ہے کہ وہ) اس کا مالک اور اس پر قادر ہے۔ قتبی نے کہا: وہ اس پر غالب ہے، کیونکہ جس بندے کی پیشانی کو تو پکڑ لے تو (گویا) تو اس پر غالب آ گیا ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ اس کو پیدا کرتا ہے پھر اس کو مارتا ہے، اور معنی قریب قریب ہے اور ناصیۃ سے مراد سر کے اگلے حصے کے بال ہیں۔ نصوت الرجل انصوہ نصواً (کہا جاتا ہے) جب تم اس کی پیشانی کو کھینچو۔

ابن جریج نے کہا: اس کو ناصیۃ کے ساتھ خاص کیا کیونکہ عرب یہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی آدمی کی صفت عاجزی اور خضوع کے ساتھ بیان کی جائے۔ پس وہ کہتے ہیں: فلاں کی پیشانی فلاں کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ اس کا مطیع ہے جس طرح چاہے وہ اس میں تصرف کرے۔ اور (عرب) جس کسی قیدی کو گرفتار کرتے اور پھر اس پر احسان کر کے اس کو آزاد کرنا چاہتے تو وہ اس کے پیشانی کے بالوں کو پکڑتے تا کہ اس طرح وہ اس پر فخر کا اظہار کریں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب فرمایا ایسے محاورہ کے ذریعے جس کو وہ اپنے کلام میں جانتے تھے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اعمال کے مقادیر مقرر فرمائے پھر ان کی طرف دیکھا پھر انسان کی تخلیق فرمائی اور نگاہ قدرت ان کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے ان اعمال سے پار ہو گئی جو وہ کرنے والے تھے پس جب ان کو پیدا فرمایا تو اس نظر کے نور کو ان کی پیشانیوں میں لکھ دیا پس یہ نور ان کی پیشانیوں کو پکڑنے والا ہے۔ یہ انہیں ان اعمال کی طرف لے جاتا ہے جو مقادیر والے دن ان پر مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین

وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے پیدا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اسے روایت کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مقرر فرمایا" (1)۔ اسی وجہ سے رسولوں کو تقویت ملی اور وہ اولوالعزم میں سے ہو گئے کیونکہ انہوں نے پیشانیوں کے نور کو ملاحظہ فرمایا اور انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اس کی ساری مخلوق ان انوار کے سبب اتباع کر رہی ہے جہاں تک اعمال میں سے ان میں اس کی بصارت پار ہو چکی ہے، پس ان میں سے جو مشاہدہ کے اعتبار سے زیادہ ہیں وہ عزم میں زیادہ پختہ ہیں، اسی وجہ سے اللہ کے نبی حضرت ہود علیہ السلام اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ یہاں تک کہہ دیا: فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ، إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا پس سازش کرلو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلاشبہ میں نے بھروسہ کرلیا ہے اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔

اس کو ناصیۃ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اعمال غیب الغیب سے ظاہر ہوئے اور مقادیر میں منصوص ہو گئے، خالق کی بصارت مخلوق کی تمام حرکات سے قدرت کے ذریعے پار ہو گئی، پھر زمین پر چلنے والے ہر حیوان کی حرکت اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان اس کی پیشانی میں رکھ دی گئی، پس اس کی اس جگہ کو ناصیہ کہہ دیا گیا، کیونکہ وہ تقدیر کے مطابق بندوں کی حرکات کو ظاہر کرتی ہے، ناصیہ ان حرکات کے اظہار سے ماخوذ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کرنے سے پہلے دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے ابوجہل کی پیشانی کے بارے میں نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (العلق) فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ پیشانیوں میں کاذبۃ اور خاطئۃ بھی ہوتی ہیں۔ ان کی بیان کردہ تاویل کے مطابق ناصیہ کو کذب اور خطا کی طرف منسوب کرنا محال ہے۔

إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ نحاس نے کہا: صراط کا لغوی معنی واضح راستہ ہے، معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اگرچہ ہر چیز پر قادر ہے مگر بغیر حق کے وہ لوگوں کو نہیں پکڑتا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی تدبیر میں کوئی خلل نہیں اور اس کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں وہ پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَإِن تَوَلَّوْا محل جزم میں ہے۔ اس وجہ سے اس میں سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور یہ اصل میں تتولوا تھا اجتماع تائین کی وجہ سے تا کو حذف کر دیا گیا۔ فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ اس کا معنی ہے کہ میں نے تمہارے لیے بیان کر دیا ہے۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دے گا اور وہ ان کو پیدا فرمائے گا جو تمہاری نسبت زیادہ اس کی اطاعت کرنے والے ہوں گے وہ اس کی وحدانیت کا اعلان کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے۔ وَيَسْتَخْلِفُ یہ ماقبل سے مقطوع ہے اس وجہ سے مرفوع ہے۔ فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم کے ارشاد میں فا کے بعد جو ثابت ہو رہا ہے یہ اس پر معطوف ہے۔ حفص سے روایت کی گئی ہے انہوں نے عاصم سے روایت کی وَيَسْتَخْلِفْ جزم کے ساتھ فا کی جگہ اور اس کے مابعد پر محمول کرتے ہوئے جس طرح وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (الاعراف)

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حجاج آدم موسیٰ علیہما السلام، جلد 2، صفحہ 335

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا یعنی تم اپنی روگردانی اور اعراض کے ذریعے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ یعنی ہر چیز کا نگہبان علیٰ بمعنی لام ہے۔

پس وہ میری حفاظت فرماتا ہے اس سے کہ تم مجھے کوئی برائی پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی جب آیا ہمارا عذاب قوم عاد کی ہلاکت کے ذریعے۔ نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کیونکہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر نجات نہیں پاتا اگرچہ اسے نیک اعمال ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ صحیح مسلم، صحیح بخاری اور دیگر (کتب) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے "تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دے سکتا"۔ انہوں نے عرض کیا: اور نہ آپ کو یا رسول اللہ؟ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا: "اور نہ مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے" (1)۔ ایک قول یہ ہے کہ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے اس ہدایت کو بیان کر دیا جو رحمت ہے۔ اور وہ چار ہزار تھے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ یعنی قیامت کے دن کے عذاب (سے) اور کہا گیا ہے: وہ سخت آندھی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات وغیرہ میں ذکر فرمایا اور اس کا بیان آئے گا۔ قشیری ابو نصر نے کہا: وہ عذاب جس کے ذریعے نبی اپنی امت کو دھمکی دیتا ہے جب آ جائے تو اللہ نبی اور اس کے ساتھ مومنین کو اس سے نجات عطا فرماتا ہے۔ ہاں! اللہ کا نبی اور اس کی قوم کو مبتلا کرنا بعید (از قیاس بات) نہیں پس وہ ان کو آزمائش میں مبتلا فرمائے تو وہ کافروں کے لیے سزا ہوگی اور مومنوں کے لیے آزمائش، جب یہ اس میں سے نہ ہو نبی نے جس کی دھمکی دی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَتِلْكَ عَادٌ مبتدا اور خبر ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ عربوں میں سے جو عاد کو منصرف نہیں بناتا پس وہ اس کو قبیلہ کا نام بنا دیتا ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے معجزات کی تکذیب کی اور ان کا انکار کیا۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ یعنی صرف حضرت ہود علیہ السلام کا، کیونکہ ان کی طرف سوائے آپ کے کوئی اور رسول نہ بھیجا گیا۔ اس کی مثال (یعنی جمع بول کر واحد مراد لینا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ (المومنون: 51) (الرُّسُلُ سے مراد) صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے علاوہ کوئی رسول نہ تھا۔ اور یہاں جمع ہے کیونکہ جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو (گویا) اس نے سب رسولوں کی تکذیب کی۔ اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام اور آپ سے پہلے رسولوں کی تکذیب کی، اور وہ اس طرح تھے کہ اگر ان کی طرف ہزار رسول بھی بھیجے جاتے تو وہ سب کا انکار کر دیتے۔ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ یعنی ان کے کمتر لوگوں نے اپنے رئیسوں کی اتباع کی۔

جبار سے مراد تکبر کرنے والا ہے اور عنید سے مراد وہ سرکش ہے جو حق کو قبول نہیں کرتا اور نہ اس کا اقرار کرتا ہے۔ ابو عبید نے کہا: عنید، عنود، عاند اور معاند سے مراد مخالفت کی وجہ سے اعراض کرنے والا ہے۔ اور اسی سے اس رگ کو عاند کہا جاتا ہے جو خون کے ذریعے بہہ پڑتی ہے۔ زاجر نے کہا:

اِنِّیْ کَبِیْرٌ لَا اُطِیْقُ الْعُنَّدَا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب تمنی المریض الموت، جلد 2، صفحہ 957

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً یعنی ان کو اس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ان کے پیچھے لگائی جائے گی قیامت کے دن اس کی مثل پس یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پر تمام ہو رہی ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ فراء نے کہا: یعنی انہوں نے اپنے رب کی نعمت کا انکار کیا، اس نے کہا: کفرتہ اور کفرت بہ کہا جاتا ہے جس طرح شکرتہ اور شکرت لہ کہا جاتا ہے (یعنی یہ باکے صلہ کے ساتھ اور صلہ کے بغیر دونوں طرح آتا ہے) اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور رہیں گے اور بعد سے مراد ہلاکت ہے اور بعد بھلائی سے دوری کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: بعد یبعد بعد جب وہ پیچھے رہ جائے اور دور ہو جائے۔ اور بعد یبعد بعدا (کہا جاتا ہے) جب وہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا:

لا یَبْعَدَنْ قومی الذین هُمُ سَمُّ العُداةِ وآفَةُ الجُزُرِ

نابغہ نے کہا:

فلا تَبْعَدَنْ إنّ المنیةَ مَنْهَلٌ وكلُّ امرئٍ یومًا به الحالُ زائلُ

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

''اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی صالح کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اس نے پیدا فرمایا تمہیں زمین سے اور بسا دیا تمہیں اس میں۔ پس مغفرت طلب کرو اس سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب قریب ہے (اور) التجائیں قبول فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰی ثَمُوْدَ یعنی ہم نے ثمود کی طرف بھیجا۔ اَخَاهُمْ یعنی نسب میں ان کا بھائی صٰلِحًا یحییٰ بن وثاب نے الی ثَمُوْدٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حسن سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے اور تمام قراء نے پورے قرآن میں اس میں اختلاف کیا ہے پس انہوں نے کسی جگہ اس کو منصرف پڑھا ہے اور کسی جگہ غیر منصرف۔ ابوعبیدہ نے گمان کیا کہ اگر جماعت کی مخالفت نہ ہو تو مناسب صرف کو ترک کرنا ہے، کیونکہ اس میں تانیث غالب ہے۔ نحاس نے کہا: جو ابوعبید نے کہا۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ کہ اس پر تانیث غالب ہے (یہ) کلام مردود ہے، کیونکہ ثمود امحلے کو بھی کہا جاتا ہے اور قبیلہ کو بھی اور اس پر قبیلہ غالب نہیں، بلکہ سیبویہ کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس ہے اور جس کے بارے میں بنوفلاں نہ کہا گیا ہو اس میں سیبویہ کے نزدیک عمدہ اس کو منصرف پڑھنا ہے جس طرح قریش، ثقیف اور جوان دونوں کے مشابہ ہو، اسی طرح ثمود بھی ہے۔ اس میں علت یہ ہے کہ جب مذکر اصل ہے اور اس کا مذکر اور مونث (دونوں) ہوں تو اصل اخف اولیٰ ہے اور تانیث عمدہ اور حسن ہے۔ سیبویہ نے تانیث میں شعر کہا:

غَلَبَ المسامیحَ الولیدُ سَمَاحةً وكَفَى قریشَ المعضِلاتِ وسادَهَا

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ گزر چکا ہے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی زمین سے اور یہ اس وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین سے پیدا کیا گیا جس طرح کے "سورۂ بقرہ" اور "سورۃ الانعام" میں گزر چکا ہے۔ اور لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیے گئے۔ ایک قول یہ ہے اس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا۔ غیرہ کی ھو کی ھا میں ادغام جائز نہیں سوائے اس شخص کی لغت کے جس نے ادراج کی صورت میں واؤ کو حذف کر دیا ہو۔ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا یعنی اس نے تمہیں اس کا آباد کرنے والا اور رہائشی بنایا۔ مجاہد نے کہا: اسْتَعْمَرَكُمْ کا معنی ہے اعمرکم یعنی اس نے تمہیں عمر بھر (زمین میں) رکھا، جیسے اعمر فلان فلانا دارہ یعنی فلاں نے فلاں کو اپنا گھر عمر بھر کے لیے دیا پس یہ عمر بھر اس کا ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس نے تمہیں اس میں آباد کیا، ان دونوں قولوں کے مطابق استفعل بمعنی افعل ہوگا جیسے استجاب بمعنی اجاب۔ ضحاک نے کہا: اس نے تمہاری عمروں کو دراز کیا اور ان کی عمریں تین سو سے ہزار (سال) تک تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک معنی ہے: اس نے تمہیں اس میں زندہ رکھا۔ زید بن اسلم کے نزدیک اس نے تمہیں حکم دیا اس میں رہائش گاہوں کی تعمیر اور درخت لگانے میں سے جس کی تمہیں ضرورت ہو اس کے بنانے کا (2)۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ اس نے کھیتی باڑی، درخت لگانا اور نہروں کی کھدوائی وغیرہ میں سے اس کی آبادی کا تمہیں الہام کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا (3) کہ بعض شافعی علماء نے کہا: استعمار سے مراد طلب عمارت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق مطالبہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ قاضی ابو بکر نے کہا: استفعل کا کلمہ عربوں کی زبان پر کئی معانی کے لیے آتا ہے ان میں سے ایک استفعل بمعنی طلب فعل ہے جس طرح کسی کا قول استحملته یعنی میں نے اس سے لادنے کا مطالبہ کیا، اور بمعنی اعتقد بھی ہے جس طرح ان کا قول: استسهلت هذا الامر یعنی میں نے اس کے آسان ہونے کا اعتقاد رکھا یا میں نے اس کو آسان پایا اور استعظمته یعنی میں نے اس کے عظیم ہونے کا اعتقاد رکھا اور اس کو عظیم پایا، اور اسی سے استفعلت بمعنی اصبت ہے جس طرح ان کا قول: استجدته یعنی میں نے اس کو عمدہ پایا، اور اسی سے بمعنی فعل ہے جس طرح اس کا قول قرّ في المكان واستقر یعنی وہ مکان میں قرار پذیر ہوا اور اس نے قرار چاہا، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يستهزؤن اور يستسخرون اسی قبیل سے ہے پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا (کا معنی ہوگا) اس نے تمہیں اس کی آبادی کے لیے پیدا فرمایا۔ استجدته اور استسهلته کے معنی پر نہیں یعنی میں نے اسے عمدہ اور سہل طریقے سے پالیا۔ یہ خالق کی طرف سے محال ہے تو یہ اس طرف راجع ہوگا کہ اس نے پیدا فرمایا، کیونکہ یہ (پیدا کرنا) اس کا فائدہ ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو مجازاً اس کے فائدہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی آبادی کی طلب ہے کیونکہ یہ لفظ اس (اللہ تعالیٰ کی ذات) کے حق میں جائز نہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے اس کی آبادی کو چاہا پس وہ استفعل کے لفظ کے ذریعے اسے لایا۔ اور یہ قول کے ذریعے اپنے سے کم مرتبہ ذات سے فعل کی استدعا ہے جب کہ یہ امر ہو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 478 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 479 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1059

اور جب ادنیٰ کی طرف سے اعلیٰ سے عقل کا مطالبہ ہو تو وہ رغبت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: استفعل بمعنی افعل ذکر نہیں کیا گیا جس طرح کے استوقد بمعنی اوقد ہے اور ہم نے اسے ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اسکان اور عمریٰ پر دلیل ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں سکنی اور رقبیٰ کے بارے میں قول گزر گیا ہے۔ جہاں تک عمریٰ کا تعلق ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے جس کے بارے میں تین اقوال ہیں (1) کہ یہ معمر (عمریٰ کرنے والا) کی زندگی میں گردن (ذات) کے منافع کا مالک بنانا ہے اس کی عمر کی مدت میں پس اگر وہ اس کی انتہا کو ذکر نہ کرے اور معمر فوت ہو جائے تو یہ اسی کے پاس واپس آجائے گا جس نے اس کو دیا تھا یا اس کے ورثاء کے لیے ہوگا، یہ قاسم بن محمد، یزید بن قسیط اور لیث بن سعد کا قول ہے۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے اور امام شافعی کے اقوال میں سے ایک ہے، اس قول کی دلیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

2۔ یہ گردن (ذات) اور اس کے منافع کا مالک بنانا ہے اور یہ نافذ شدہ ہبہ ہے جو واہب کی طرف واپس نہ ہو سکے گا یہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی ان دونوں کے اصحاب، ثوری، حسن ابن حی، امام احمد بن حنبل، ابن شبرمۃ اور ابو عبید کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: جس نے عمریٰ کیا کسی بندے کو اس کی زندگی کا تو یہ اس کی زندگی میں اس کا ہوگا اور اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کے لیے ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی گردن کا مالک بن چکا ہے اور دینے والے کا زندگی اور عمر کی شرط لگانا باطل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمریٰ جائز ہے''، اور ''عمریٰ اس کے لیے ہے جس کو ہبہ کیا گیا'' (1)۔ (۳) اگر اس نے ''عمرت'' کہا اور اس کے جانشین کا ذکر نہ کیا تو یہ پہلے قول کی طرح ہے اور اگر اس نے عمرتہ لعقبک کہا تو یہ دوسرے قول کی طرح ہے۔ یہی زہری، ابو ثور، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن اور ابن ابی ذئب نے کہا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا اور یہی موطا میں ان کے قول کا ظاہر ہے۔ آپ سے اور آپ کے اصحاب سے (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) معروف یہ ہے کہ معمر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جب معمر کی اولاد ختم ہو جائے اگر معمر (عمریٰ کرنے والا) زندہ ہو ورنہ اس کی طرف جو اس کے ورثاء میں سے زندہ ہو اور اس کی میراث کا لوگوں میں زیادہ حق دار ہو۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک معمر (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) عمریٰ کے لفظ کے ذریعے اشیاء میں سے کسی چیز کی گردن کا مالک نہیں بنے گا، عمریٰ کے لفظ سے وہ منفعت کا مالک ہوگا نہ کہ گردن کا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے وقف شدہ چیزوں کے بارے میں بھی کہا ہے: جب کسی نے کوئی چیز کسی آدمی کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے وقف کی تو وہ اس کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور اگر کسی معین آدمی کے لیے اس کی زندگی میں وقف کیا تو وہ رجوع کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح عمریٰ بھی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے یہی موطا کا ظاہر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس آدمی نے کسی آدمی اور اس کی اولاد کے لیے عمریٰ کیا، اس نے کہا یہ میں نے تجھے اور تیری اولاد کو دیا جو تم میں سے بچ گیا تو یہ اس کے لیے ہوگا جس کو عطا کیا گیا اور یہ (عمریٰ) اپنے مالک کی طرف نہیں لوٹے گا اس وجہ سے کہ اس نے یہ ایسی عطا کی ہے جس میں وارثت واقع ہوگی'' (2)، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الهبة، ما قیل العمریٰ والرقبیٰ، جلد 1، صفحہ 357 2۔ صحیح مسلم، کتاب الهبة، العمریٰ، جلد 2، صفحہ 38

انہی سے ہے کہ انہوں نے کہا: وہ عمریٰ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا وہ یہ ہے کہ وہ کہے: یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہے اور اگر اس نے کہا: یہ تیرے لیے ہے جب تک تو زندہ رہے تو یہ (عمریٰ) اپنے مالک کے پاس لوٹ جائے گا۔ معمر نے کہا اس پر زہری فتویٰ دیا کرتے تھے (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: قرآن کا معنی دوسرے قول والوں کے ساتھ چلتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: وَاسْتَعْمَرَكُمْ یعنی اعمرکم پس نیک آدمی نے اس میں اپنی زندگی کی مدت نیک عمل اور اپنی موت کے بعد ذکر جمیل اور عمدہ تعریف کے ذریعے عمریٰ کیا اور فاجر آدمی نے اس کے برعکس (عمریٰ کیا) پس دنیا ان دونوں کے لیے زندگی اور موت کے اعتبار سے ظرف ہے۔ کہا جاتا ہے: بے شک عمدہ تعریف اولاد کے قائم مقام ہے۔ تنزیل میں وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ (الشعراء) سے مراد عمدہ تعریف ہے، کہا گیا ہے، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ (الصافات) اور ہم نے بنا دیا فقط ان کی نسل کو باقی رہنے والا اور فرمایا: وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾ (الصافات) اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاسْتَغْفِرُوْهُ یعنی اس سے بتوں کی عبادت سے مغفرت کا سوال کرو۔ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ یعنی اس کی عبادت کی طرف رجوع کرو۔ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ یعنی جواب دینے کے قریب اس آدمی کے لیے جو اس سے دعا مانگے، سورۂ بقرہ میں اللہ کے ارشاد فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ:186) میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

''انہوں نے کہا: اے صالح! تم ہی ہم میں (ایک شخص) تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں اس سے پہلے۔ کیا تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الھبة، العمریٰ، جلد 2، صفحہ 38

روکتے ہو ہمیں اس سے کہ ہم عبادت کریں ان (بتوں) کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ اور بے شک ہم اس امر کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا کی ہو مجھے اپنی جناب سے خاص رحمت تو کون ہے جو بچائے گا مجھے اللہ (کے عذاب سے) اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم تو نہیں زیادہ کرنا چاہتے میرے لیے سوا نقصان کے۔ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اسے کھاتی پھرے اللہ تعالیٰ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب بہت جلد۔ پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے فرمایا: لطف اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن تک یہ (اللہ کا) وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر جب آگیا ہمارا حکم تو ہم نے بچالیا صالح کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے نیز (بچالیا) اس دن کی رسوائی سے۔ بے شک (اے محبوب!) تیرا رب ہی بہت قوت والا بہت عزت والا ہے اور پکڑ لیا ظالموں کو ایک خوفناک کڑک نے اور صبح کی انہوں نے اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے گرے پڑے تھے۔ (انہیں یوں نابود کر دیا گیا) گویا وہ یہاں کبھی آباد ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے انکار کیا اپنے رب کا۔ سنو! بربادی ہو ثمود کے لیے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ یعنی اس سے پہلے ہم امید کرتے تھے کہ آپ ہی ہم میں سے سردار ہوں گے، یعنی آپ کے دعویٰ نبوت سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کے معبودوں کو عیب کی طرف منسوب کرتے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور وہ آپ سے انہی کے دین کی طرف لوٹنے کی امید کرتے تھے، پس جب آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا تو انہوں نے کہا: ہماری تم سے وابستہ امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ اَتَنْهٰىنَآ استفہام ہے جس کا معنی انکار ہے۔ اَنْ نَّعْبُدَ یعنی (عن ان نعبد) اس بات سے کہ ہم عبادت کریں۔ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا، ان محل نصب میں ہے عن حرف جر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے۔ وَ اِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ سورۂ ابراہیم میں وانا ہے اور اصل میں واننا ہے تین نون ثقیل ہوئے پس تیسرے نون کو ساقط کر دیا۔ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ، خطاب حضرت صالح علیہ السلام کو ہے۔ سورۂ ابراہیم میں تدعوننا ہے کیونکہ مخاطب تمام رسول صلوات اللہ وسلامہ علیہم ہیں۔ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ یہ اربته سے ہے فأنا اُریبه سے ہے جب تو کوئی ایسا کام کرے جو تیرے پاس بے چینی کو ثابت کر دے۔ ہذلی نے کہا:

كُنْتُ إِذَا أَتَوْتُهُ مِن غَيْبِ يَشُمُّ عِطْفِي وَ يَبُذُّ ثَوْبِي
كَأنَّمَا أرِبْتُهُ بِرَيْبِ

اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً اس کا معنی حضرت نوح علیہ السلام کے قول میں گزر چکا ہے۔ فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ استفہام ہے جس کا معنی نفی ہے یعنی کوئی بھی اس کی طرف سے میری مدد نہیں کرے گا اگر میں نے اس کی نافرمانی کی۔ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ یعنی گمراہی اور بھلائی سے دور۔ فراء کا

یہی قول ہے اور نقصان ان (کفار) کے لیے ہے نہ کہ آپ علیہ السلام کے لیے گویا کہ آپ نے یوں کہا: سوائے تمہارے لیے نقصان کے نہ کہ میرے لیے۔ اور کہا گیا: اپنے خسارے کو دیکھے بغیر اپنے آباء کے دین کے ذریعے حجت پکڑنے میں تم میرے لیے زیادہ نہیں کرتے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ مبتدا اور خبر ہے۔ لَكُمْ اٰيَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور عامل هذه میں تنبیہ یا اشارہ کا معنی ہے۔ اور کہا گیا: نَاقَةُ اللّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (اونٹنی) کو ان کے لیے پہاڑ سے نکالا ان کے مطالبہ پر، اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائیں گے۔ ایک قول یہ ہے: حجر کے ایک طرف صماء کی منفرد چٹان سے اللہ تعالیٰ نے اسے نکالا جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے، جب اونٹنی نکلی ان کے مطالبہ پر تو ان کو اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ، امر اور جواب امر ہے، فَذَرُوْهَا سے نون کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ یہ امر ہے اور وذر اور واذر نہیں کہا جاتا مگر شاذ اور نحویوں کے اس میں دو قول ہیں، سیبویہ نے کہا: (واو) کو چھوڑ کر اس سے مستغنی ہو گئے اور کسی اور نے کہا: جب واؤ ثقیل تھی اور کلام میں اس کے معنی کا فعل بھی تھا جس میں واؤ نہیں تو انہوں (نحویوں) نے اس کو لغو کر دیا، ابو اسحاق زجاج نے کہا: تاکل، کا رفع بھی جائز ہے حال اور جملہ مستانفہ ہونے کی بنیاد پر۔ وَلَا تَمَسُّوْهَا نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔ بِسُوْٓءٍ فراء نے کہا: کونچ کاٹنے کے ذریعے۔ فَيَاْخُذَكُمْ نہی کا جواب ہے۔ عَذَابٌ قَرِيْبٌ یعنی اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹنے کے قریب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ۔ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَعَقَرُوْهَا اس کی کونچیں تو ان میں سے بعض نے کاٹیں اور اس کو تمام کی طرف منسوب کر دیا گیا کیونکہ یہ باقی لوگوں کی رضامندی سے تھا۔ اور اس کی کونچوں کے کاٹنے کے بارے میں سورۂ اعراف میں کلام گزر گیا ہے اور آئے گا بھی۔ فَقَالَ تَمَتَّعُوْا یعنی ان کو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: تم لطف اندوز ہو لو، یعنی عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ عزوجل کی نعمتوں کے ذریعے۔ فِيْ دَارِكُمْ، فی بلادکم مراد ہے یعنی اپنے شہر میں، اگر آپ دار سے گھر مراد لیتے تو آپ دورکم فرماتے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے گھر اور اپنی رہائش گاہ میں لطف اندوز ہو لے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) یعنی ہر ایک بچہ۔ اور زندگی کے ساتھ لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کو تعبیر کیا، کیونکہ میت نہ لذت حاصل کرتی ہے اور نہ کسی چیز کے ساتھ لطف اندوز ہوتی ہے۔ بدھ کے دن کونچیں کاٹی گئیں، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے دن وہ رہے اور اتوار کے دن ان پر عذاب آیا۔ وہ تین دن مقیم رہے، کیونکہ اس اونٹنی نے تین بار آواز نکالی تھی جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ پہلے دن ان کے رنگ زرد ہو گئے، پھر دوسرے دن سرخ ہو گئے اور پھر تیسرے دن سیاہ ہو گئے اور چوتھے دن وہ ہلاک ہو گئے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء مالکیہ نے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم سے تین دن اللہ کے عذاب کو مؤخر کرنے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جب مسافر چار راتوں کی اقامت نہ کرے تو وہ قصر کرے گا، کیونکہ تین دن اقامت کے حکم سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 480

خارج ہیں، اس سلسلہ میں علماء کے جو اقوال ہیں وہ سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ یعنی مکذوب بمعنی کذب ہے ایک قول یہ بھی ہے: غیر مکذوب فیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی ہمارا عذاب نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا یہ گزر چکا ہے۔ وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىٕذٍ یعنی اور ہم نے ان کو نجات دی اس دن کی رسوائی سے، یعنی اس کی رسوائی اور ذلت سے۔ کہا گیا ہے: واؤ زائدہ ہے یعنی ''نجیناھم من خزی یومئذ'' ہے کہ ہم نے ان کو اس دن کی رسوائی سے نجات دی۔ سیبویہ اور اہل بصرہ کے نزدیک اس کو زائد کرنا جائز نہیں اور کوفیوں کے نزدیک لما اور حتی کے ساتھ اس کو زائد کرنا جائز ہے ان کے علاوہ نہیں۔ نافع اور کسائی نے یومئذ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یوم کی اذ کی طرف اضافت کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہم سے ابو زید نے ابو عمرو سے بیان کیا کہ اس نے ومن خزی یومئذ پڑھا یعنی اس نے یا کو یا میں ادغام کیا اور مضاف کیا اور یومئذ میں میم کو کسرہ دیا۔ نحاس نے کہا: جس کو سیبویہ اور ان کے قریب قریب والے نحوی ابو عمرو سے اس قسم کی قراءت روایت کرتے ہیں وہ اخفا ہے جہاں تک ادغام کا تعلق ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ التقاء ساکنین ہے اور زا کا کسرہ جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ یعنی چوتھے دن میں ان پر چنگھاڑ ہوئی تو وہ مر گئے اور (اخذ) کو مذکر ذکر کیا کیونکہ الصحیۃ اور الصیاح ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ جبریل امین کی چیخ تھی۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ آسمان سے ایک چنگھاڑ آئی تھی جس میں ہر بجلی کی کڑک اور زمین کی ہر چیز کی آواز تھی پس ان کے دل پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فرمایا اور سورۂ اعراف میں فاخذتھم الرجفۃ فرمایا، اس کا بیان وہاں گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے، جب انہیں عذاب کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ایک دوسرے کو کہا: اگر اچانک عذاب آ گیا تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا پھر ہم کیا کریں گے؟ پس انہوں نے اپنی تلواریں، نیزے اور اپنے جتھے لے لیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ ہزار قبیلے تھے، ہر قبیلہ میں بارہ ہزار جنگجو تھے۔ وہ راستوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو گئے، ان کا گمان تھا کہ وہ عذاب سے لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو حکم دیا جو سورج کے ساتھ موکل ہے کہ وہ ان کو اپنی گرمی کا عذاب دے پھر ان پر اس کا کم از کم عذاب یہ تھا کہ ان کے ہاتھ جل گئے اور پیاس سے ان کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹک گئیں اور جو جانور وغیرہ ان کے پاس تھے وہ مر گئے اور چشموں کا پانی جوش سے ابلنے لگا یہاں تک کہ وہ آسمان تک پہنچ گیا، وہ جس چیز پر گرتا اس کو اپنی گرمی کی شدت سے ہلاک کر دیتا۔ اسی طرح جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ وہ ان کی روحوں کو قبض نہ کرے ان کو عذاب دینے کے لیے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے (1)۔ وہ مٹی کے ساتھ اس پرندے کی طرح چمٹ گئے جو اپنا سینہ زمین پر لگا دے۔ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 481

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

''اور بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر انہوں نے کہا: (اے خلیل!) آپ پر سلام ہو۔ آپ نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو۔ پھر آپ جلدی لے آئے (ان کی ضیافت کے لیے) ایک بچھڑا بھنا ہوا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں، ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔ اور آپ کی اہلیہ (سارہ پاس) کھڑی تھیں وہ ہنس پڑیں تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى یہ حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ ہے اور وہ قرابت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم کے چچا کے بیٹے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں شام کے نواح میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بستیاں فلسطین کے شہروں میں تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو اتارا تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرے او وان کے پاس مہمان بنے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو بھی مہمان بنتا آپ اس کی ضیافت بہت اچھے طریقے سے کرتے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت لے کر گزرے تو آپ نے انہیں مہمان سمجھا۔ جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: یہ نو فرشتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ گیارہ فرشتے تھے جو نہایت خوبصورت اور روشن چہروں والے جوانوں کی شکل میں تھے۔

بِالْبُشْرٰى ایک قول یہ ہے: بچے کی (خوشخبری) ایک قول یہ ہے: قوم لوط کی ہلاکت کی خوشخبری اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو خوشخبری دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں (2)، اور یہ کہ آپ پر کوئی خوف نہیں۔ قَالُوْا سَلٰمًا یہ منصوب ہے اس پر فعل کے واقع ہونے کی وجہ سے، جس طرح آپ کہتے ہیں: قالوا خیرا انہوں نے اچھی بات کہی۔ یہ طبری کا اختیار کردہ قول ہے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ (الکہف: 22) کا تعلق ہے، اس میں ثلاثۃ اسم ہے مقول نہیں۔ اور اگر دونوں کو رفع دیا جائے یا دونوں کو نصب دیا جائے قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ تو لغت عرب میں جائز ہے۔ ایک قول یہ ہے: مصدر ہونے کی وجہ سے نصب دی گئی۔ ایک قول یہ ہے: قَالُوْا سَلٰمًا یعنی انہوں نے آپ کو صحیح قول کے ذریعے مخاطب کیا۔ جس طرح فرمایا: وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ (الفرقان) یعنی صحیح بات۔ پس سَلٰمًا ان کے قول کا معنی ہے نہ کہ اس کا لفظ، ابن عربی نے اس کو اس کا معنی کہا اور اسی کو اختیار کیا۔ ابن عربی نے کہا (3): کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے جب لفظ کے ذکر کا ارادہ فرمایا تو بعینہ یہ فرمایا پس فرشتوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد: 24) سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ (الزمر: 73) اور کہا گیا ہے: انہوں نے آپ کے لیے دعا کی اور معنی ہوگا سلمت سلاما، قَالَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 482
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1060

سَلٰمٌ اس کے رفع کی دو وجہیں ہیں: ایک مبتدا کے مضمر ہونے کے طور پر یعنی ھو سلام اور امری سلام اور دوسری (وجہ یہ ہے کہ) بمعنی سلام علیکم ہے جب اس کو تحیۃ کے معنی میں لیا جائے پس خبر کو مضمر کر دیا گیا اور سلام کو کثرت استعمال کی وجہ سے نکرہ ذکر کرنا جائز ہے۔ الف لام کو حذف کر دیا گیا جس طرح اللھم میں الف لام کو حذف کیا جاتا ہے اور سلم بھی پڑھا گیا ہے، فراء نے کہا: السلم اور السلام ایک ہی معنی میں ہیں جس طرح الحل اور الحلال (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ، اَنْ بمعنی حتی ہے یہ بڑے بڑے نحویوں کا قول ہے، ابن عربی نے اسے بیان کیا۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی فما لبث حتی جاء یعنی بچھڑے کو لانے میں آپ نے سستی نہ کی۔ پس جب حرف جر کو حذف کیا گیا تو ان محل نصب میں باقی رہا۔ اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کی ہے اور ما نافیہ ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور فراء نے کہا: فما لبث مجیہ یعنی اس کا آنا سست نہ ہوا۔ پس ان محل رفع میں ہے اور لبث میں کوئی ضمیر نہیں جب کہ ما نافیہ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ما بمعنی الذی ہو اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو (یعنی اس کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں) اور ان جاء، ما کی خبر ہو یعنی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلدی کیا وہ آپ کا بھنے ہوئے بچھڑے کو لانا ہے اور حنیذ بھنا ہوا۔ ایک قول یہ ہے: وہ پتھر کی گرمی کے ذریعے بھنا ہوا تھا آگ کا اس کو چھوئے بغیر۔

کہا جاتا ہے: حنذت الشاۃ احنذھا حنذا یعنی میں نے اسے بھونا، اور میں نے اس کے اوپر گرم پتھر رکھا تا کہ وہ اسے بھون دے پس وہ بھنا ہوا ہے۔ اور حنذت الفرس أحنذہ (کہا جاتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ تو اسے ایک یا دو چکر دوڑائے پھر اس کو دھوپ میں جل ڈال دے تا کہ اسے پسینہ آئے تو وہ محنوذ اور حنیذ کہلائے گا اور اگر اسے پسینہ نہ آئے تو اسے کبا کہا جائے گا۔ حنذ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے حنیذ سے مراد بال صاف کیا ہوا، بھنا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: حنیذ سے مراد پکا ہوا گوشت ہے اور حنیذ بمعنی محنوذ ہے اور آپ بچھڑا لائے کیونکہ آپ کے مال میں گائے زیادہ تھیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں مہمان کے آداب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی ضیافت میں جلدی کی جائے پس جو اس وقت موجود اور میسر ہو وہ پیش کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس کے علاوہ پیش کر دیا جائے اگر اس کو پیش کرنا ضروری ہو تو اسے اس چیز کا مکلف نہ بنایا جائے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ ضیافت مکارم اخلاق، آداب اسلام اور انبیاء و صلحاء کے اخلاق میں سے ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے آدمی ہیں جنہوں نے ضیافت کی جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر گیا۔

عام اہل علم کے نزدیک یہ واجب نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ "ضیافت تین دن ہے اور اس کا جائزہ ایک دن اور ایک رات ہے جو اس کے بعد ہے تو وہ صدقہ ہے" (2) اور جائزہ سے مراد عطیہ اور وہ صلہ ہے جس کی اصل استحباب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کی عزت کرنی چاہیے اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 82
2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے'' (1)۔ اور پڑوسی کا اکرام واجب نہیں تو ضیافت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم۔ لیث اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑتے ہوئے لیلۃ الضیف حق (2) اور دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے۔

اس سلسلہ میں جو ہم نے اشارہ کیا وہ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔ ابن عربی نے کہا (3): یہ بہت سارے لوگوں کا قول ہے: ضیافت کا وجوب ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ ضعیف ہے، کیونکہ وجوب ثابت نہیں اور ناسخ وارد ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اس میں فاستضفناھم فابوا ان یضیفونا فَلُدِغَ سید ذالک الحی (4) الحدیث کے الفاظ ہیں یعنی ہم نے ان کا مہمان بننا چاہا تو انہوں نے ہمیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا تو اس گاؤں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ روایت اس بات میں ظاہر ہے کہ اگر ضیافت لازم ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضیافت سے انکار کرنے والے لوگوں کو ضرور ملامت فرماتے اور ان کے سامنے اس کو ضرور بیان فرماتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے؟ امام شافعی اور محمد بن عبدالحکیم اس جانب گئے ہیں کہ اس کے مخاطب شہری اور دیہاتی لوگ ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: شہری لوگوں پر ضیافت نہیں۔ سحنون نے کہا: ضیافت صرف دیہاتیوں پر ہے جہاں تک شہریوں کا تعلق ہے تو شہروں میں مسافر ہوٹلوں میں آتے ہیں۔

انہوں نے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دلیل پکڑی انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ضیافت دیہاتی لوگوں پر ہے اور شہریوں پر نہیں''۔ یہ حدیث صحیح نہیں، ابراہیم بن اخی عبدالرزاق متروک الحدیث اور جھوٹ کی طرف منسوب ہے اور یہ روایت ان روایات میں سے ہے جن کو اس نے اکیلا روایت کیا ہے اور اس کی وضع کی طرف منسوب ہے۔ یہ ابوعمر بن عبدالبر کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: ضیافت درحقیقت فرض کفایہ ہے، کسی آدمی نے کہا: یہ دیہاتوں میں واجب ہے جہاں کوئی کھانا اور ٹھکانا نہیں ہوتا، بخلاف شہروں کے کیونکہ یہ تو ٹھکانوں اور کھانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان کریم ہے اور ضیافت کرامت ہے، پس اگر وہ اجنبی ہو تو یہ فرض ہوگی (5)۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت تھوڑی تھی پس حبیب نے حبیب کی طرف سے اس کا شکر ادا کیا۔ یہ قطعیت کے مقام پر ظنیت اور نقل کی جگہ قیاس کے ذریعے فیصلہ ہے، ان کو کہاں سے پتہ چلا کہ وہ تھوڑی تھی؟ بلکہ مفسرین نے نقل کیا کہ فرشتے تین تھے، جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور تین کی خاطر بچھڑا تو بہت زیادہ ہے، پس کتاب اللہ کی یہ تفسیر رائے کے ساتھ کیسی ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی امانت کی قسم! یہی وہ تفسیر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، ما جاء فی الضیافۃ، جلد 2، صفحہ 170　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1061

4۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، ما یعطی فی الرقیۃ علی أحیا، جلد 1، صفحہ 304　5۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1062

مذموم ہے پس اس سے اجتناب کرو، پس تم نے اس کو جان لیا(1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ سنت یہ ہے کہ جب مہمان کو کھانا پیش کیا جائے تو پیش کرنے والا کھانے میں جلدی کرے پس مہمان کی تکریم پیش کرنے میں جلدی کرنا ہے اور گھر والے کی تکریم اس کے قبول کرنے میں جلدی کرنا ہے۔ پس جب انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اجنبی خیال کیا، کیونکہ وہ عادت سے نکل گئے اور انہوں نے معمول کی مخالفت کی۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ بات ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود (نوک اور پر کے بغیر) تیروں کے ذریعے غور وفکر کرتے ہوئے گوشت کو کریدر ہے تھے اور ان کے ہاتھ گوشت تک نہیں پہنچ رہے تھے تو آپ نے جب ان کی طرف سے یہ دیکھا تو **نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً** یعنی دل میں، اور ایک قول ہے: آپ نے محسوس کیا، وجوس سے مراد دخول ہے۔ شاعر نے کہا:

جاء البريدُ بقرطاسٍ يَخُبُّ به فأوجسَ القلبُ من قرطاسهِ جَزَعًا(2)

خِيْفَةً یعنی دہشت زدہ ہونا اور وہ جب مہمان کو نہ کھاتے ہوئے دیکھتے تو اس کو برا سمجھتے تھے تو فرشتوں نے کہا: **لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ** ڈریئے نہیں ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔

مسئلہ نمبر 6۔ کھانے کے آداب میں سے ہے کہ میزبان کو اپنے مہمان کے بارے میں دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ کھا رہا ہے یا نہیں؟ یہ کام توجہ اور اچٹتی نظر ڈالنے سے ہونا چاہیے نہ کہ نظر گاڑ دینے سے، بیان کیا گیا ہے کہ ایک بدوی نے سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ کھانا کھایا، سلیمان نے بدوی کے لقمے میں بال دیکھ لیا تو اسے کہا: بال کو اپنے لقمے سے ہٹایئے۔ اس (بدوی) نے کہا: کیا تو میری طرف اس آدمی کی طرح دیکھ رہا ہے جو میرے لقمے میں بال کو دیکھتا ہے؟ (یعنی اتنی توجہ سے دیکھ رہا ہے) اللہ کی قسم میں تیرے ساتھ نہیں کھاؤں گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: ذکر کیا گیا ہے کہ یہ قصہ ہشام بن عبدالملک کے ساتھ ہوا نہ کہ سلیمان کے ساتھ اور بدوی اس کے پاس سے یہ کہتا ہوا نکلا:

وللموتُ خيرٌ من زيارة باخلٍ يلاحظُ أطرافَ الأكيلِ على عَمْدِ

''موت بہتر ہے ایسے بخیل کی زیارت سے جو کھانے والے کی اطراف کو جان بوجھ کر ملاحظہ کرتا ہے''۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ** نکر بمعنی انکر ہے یعنی آپ نے ان کو نہ جانا، آپ کہتے ہیں: نکرتک وانکرتک واستنکرتک جب آپ اسے وعدہ خلافی پر پائیں۔ شاعر نے کہا:

وأنكرتني وما كان الذي نكرتْ من الحوادثِ إلا الشَّيبَ والصَّلَعَا

دونوں لغتوں کو جمع کر دیا گیا اور نکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھے اور انکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنے دل کے ساتھ دیکھے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1063
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 283

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ مبتدا اور خبر ہے یعنی وہ کھڑی فرشتوں کو دیکھ رہی تھی، کہا گیا ہے: وہ پردے کے پیچھے تھی۔ ایک قول یہ ہے: وہ فرشتوں کی خدمت کر رہی تھی اور آپ (ابراہیم علیہ السلام) بیٹھے تھے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: وہ کھڑی نماز پڑھ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں (1)۔ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ وھو قاعد ہے (یعنی آپ کی بیوی کھڑی تھی اور آپ بیٹھے تھے)

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَضَحِكَتْ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کو حیض آیا (2)، حالانکہ وہ آیسہ تھی، بشارت کو ثابت کرنے کے لیے، اس پر لغویوں نے شعر پڑھا:

وإني لآتي العِرسَ عند طُهورها وأهجُرها يوماً إذا تَكُ ضاحِكَا

دوسرے نے کہا:

وضِحْكُ الأرانبِ فوق الصَّفَا كمثلِ دمِ الجوفِ يوم اللِّقاء (3)

اور عرب کہتے ہیں: ضحکت الأرنب جب اسے حیض آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ سے روایت ہے کہ یہ عربوں کے قول ضحکت الکافورۃ سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اس گابھے کا چھلکا ہے جب وہ پھٹ جائے۔

بعض لغویوں نے کلام عرب میں ضحکت بمعنی حاضت ہونے کا انکار کیا ہے اور جمہور نے کہا: یہ ضحک معروف ہے اور اس میں ان کا اختلاف ہے۔ ایک قول ہے: وہ تعجب کا ہنسنا ہے ابوذؤیب نے کہا:

فجاءَ بمزجٍ لم يَرَ الناسُ مثله هو الضَّحْكُ إلا أنه عمل النَّحْلِ (4)

مقاتل نے کہا: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف سے ہنسی اور تین آدمیوں کی جماعت کے سبب آپ سے لرز اٹھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے سو آدمی کے قائم مقام تھے۔ اس نے کہا: لغت میں ضحک سے مراد حیض لینا درست نہیں، ابو عبید اور فراء نے اس کا انکار کیا، فراء نے کہا: میں نے یہ کسی ثقہ آدمی سے نہیں سنا، یہ صرف کنایہ ہے۔ روایت میں ہے کہ فرشتوں نے بچھڑے پر ہاتھ پھیرا۔ آپ علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنی ماں کے پاس چلے گئے، اس وقت حضرت سارہ ہنسیں تو انہوں نے آپ (حضرت سارہ) کو اسحاق کی خوشخبری دی۔ کہا جاتا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے مہمانوں کی تکریم کا ارادہ کیا تو سارہ کو ان کی خدمت کے لیے کھڑا کیا، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ ہے یعنی وہ ان کی خدمت کے سلسلہ میں کھڑی ہوئی اور کہا جاتا ہے: قَآىِٕمَةٌ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی وجہ سے۔ فَضَحِكَتْ یعنی ان کے قول لَا تَخَفْ کی وجہ سے امن کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی۔ فراء نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہے: پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی تو وہ ہنس پڑی یعنی بچے کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی اس حال میں کہ وہ بوڑھی تھی، اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ (ہنسنا) کس وجہ سے تھا۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں کئی اقوال ہیں: ان میں سے سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ جب انہوں نے نہ کھایا آپ علیہ السلام نے ان کو نہ پہچانا اور ان سے خوف زدہ ہوئے پھر جب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 484 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

انہوں نے کہا: آپ نہ ڈریئے اور انہوں نے آپ کو خبر دی کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں تو آپ اس وجہ سے خوش ہوئے، پس آپ کی بیوی بھی آپ کی خوشی کی وجہ سے خوش ہو کر ہنسی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس (سارہ) نے آپ کو کہا تھا میرا گمان ہے کہ یہ لوگ عنقریب ان پر عذاب لے کر آئیں گے پس وہ حضرت لوط علیہ السلام کو آپ سے ملا دے گا، پس جب فرشتے وہ لے آئے جو اس نے کہا تو وہ اس کی وجہ سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔ نحاس نے کہا: اگر اس کی سند صحیح ہے تو یہ حسن ہے۔ ضحاک دانتوں کا ظاہر ہونا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضحک چہرے کا روشن ہونا ہو آپ کہتے ہیں: رایت فلانا ضاحکا تو اس سے مراد ہے مشرقا اور أتیت علی روضۃ تضحک یعنی مشرقۃ، حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ بادلوں کو بھیجتا ہے فیضحک احسن الضحک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجلی سے اس کے روشن ہونے کو ضحک بنا دیا۔ یہ کلام مستعار ہے۔ (اس میں استعارہ ہے) مکہ کے قراء میں سے ایک آدمی سے روایت ہے جس کو محمد بن زیاد اعرابی کہا جاتا ہے۔ فضحکت حا کے فتحہ کے ساتھ۔ مہدوی نے کہا: فضحکت میں حا کا فتح غیر معروف ہے اور ضَحِكَ يَضْحَكُ، ضَحْكا و ضِحكا و ضِحِكا و ضَحِكا چار لغتیں ہیں اور الضُّحْكَة سے مراد ایک مرتبہ کا ہنسنا ہے۔ اسی سے کثیر کا قول ہے:

غَلِقت لضَحْكتِهِ رقابُ المال

یہ جوہری نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ابو اسید ساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شادی کے ولیمہ میں دعوت دی۔ اس کی بیوی اس دن ان کی خدمت کرنے والی تھی حالانکہ وہ دلہن تھی۔ حضرت سہل نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پلایا؟ کیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رات کے وقت کھجوروں کا رس نکالا تور (برتن جس میں عربی پیتے تھے) میں، پس جب آپ نے تناول فرمایا تو اس نے وہی رس آپ کو پلایا (1)۔ امام بخاری نے اس کو روایت کیا ہے (2) اور اس کا عنوان باندھا باب قیام المراۃ علی الرجال فی العرس وخدمتھم بالنفس ہمارے علماء نے کہا: اس میں بیوی کا اپنی شادی کے موقع پر اپنے شوہر اور اس کے دوستوں کی خدمت کا جواز ہے۔ اور اس میں یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے اہل (بیویاں) کو اپنے نیک دوستوں کے سامنے پیش کرے اور ان سے ان (دوستوں) کی خدمت لے، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ پردہ کے نزول سے پہلے ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ طبری نے ذکر کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بچھڑا پیش کیا تو انہوں نے کہا: ہم کھانا بغیر قیمت کے نہیں کھاتے۔ تو آپ نے ان کو کہا: اس کی قیمت یہ ہے کہ تم اس کی ابتدا میں اللہ کا ذکر کرو اور اس کے آخر میں اس کی حمد کرو۔ جبریل امین نے اپنے اصحاب کو کہا: حق کی قسم اللہ نے اس کو خلیل بنایا (3)۔ ہمارے علماء نے کہا: انہوں نے نہ کھایا کیونکہ فرشتے نہیں کھاتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے اس بات کو آسان بنا دیا ہے کہ وہ جسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، اباحۃ النبیذ، جلد 2، صفحہ 168
2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حق اجابۃ الولیمہ، جلد 2، صفحہ 778
3۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 86

اور ہیئت کے اعتبار سے آدمی کی شکل اختیار کر لیں اس نے ان کے لیے کھانا کھانا بھی آسان بنا دیا ہو، مگر یہ کہ علماء کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو آدمی کی صفت پر بھیجا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضیافت کا مکلف بنایا یہاں تک کہ جب آپ نے توقف کو دیکھا اور ڈرے تو اچانک وہ آپ کے پاس خوشخبری لے آئے۔

مسئلہ نمبر 12۔ یہ (آیت) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کھانے کی ابتدا میں بسم اللہ اور اس کے آخر میں الحمد للہ ہم سے پہلی امتوں میں بھی مشروع رہا، اسرائیلیات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے کھانا تناول نہیں فرماتے تھے، جب کھانا حاضر ہوتا تو آپ کسی کو بھیجتے جو پوچھتا کہ آپ کے ساتھ کون کھانا کھائے گا؟ تو وہ ایک دن ایک آدمی کو ملا، جب وہ آپ کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے فرمایا: بسم اللہ پڑھو، آدمی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ اللہ کون ہے؟ آپ نے اسے فرمایا: میرے کھانے سے نکل جا، جب وہ نکل گیا تو آپ پر جبریل امین نازل ہوئے، اس نے آپ کو کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ اس کو اس کی ساری عمر اس کے کفر کے باوجود رزق دیتا رہا اور آپ نے ایک لقمہ کا بخل کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پریشان حال نکلے اس حال میں کہ اپنی چادر کو کھینچ رہے تھے اور فرمایا: لوٹ آ، اس نے کہا: میں نہیں لوٹوں گا یہاں تک کہ تو مجھے خبر دے کہ تو مجھے بغیر کسی سبب کے کیوں واپس لوٹا رہا ہے؟ آپ نے اس کو معاملہ کے بارے میں خبر دی۔ تو اس نے کہا: یہ کریم پروردگار ہے، میں اس پر ایمان لایا، اور وہ داخل ہوا اور اس نے بسم اللہ پڑھی اور حالت ایمان میں کھانا کھایا۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ جب حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو حضرت سارہ نے خواہش کی کہ اس کا بھی بیٹا ہو اور وہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے مایوس ہو چکی تھی، تو انہوں نے ایسے بیٹے کی خوشخبری دی جو نبی ہوگا اور نبی کو پیدا کرے گا، تو یہ اس (سارہ) کے لیے خوشخبری تھی کہ وہ اپنے پوتے کو دیکھے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ حمزہ اور عبداللہ بن عامر نے یعقوب نصب کے ساتھ پڑھا اور باقیوں نے اس کو مرفوع پڑھا۔

رفع اس معنی کی بنیاد پر ہوگا: ويحدث لها من وراء اسحق يعقوب یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل کی وجہ مرفوع ہو جو من میں عامل ہے گویا کہ معنی یہ ہوگا: وثبت لها من وراء اسحق يعقوب یہ جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، اور یہ حال کے مقام پر ہو، یعنی بشرها باسحق مقابلا له يعقوب اور نصب اس معنی پر ہوگی: ووهبنا لها من وراء اسحق یعقوب، کسائی، اخفش اور ابو حاتم نے اس بات کو جائز قرار دیا کہ یعقوب محل جر میں ہو اس معنی کی بنیاد پر وبشرناها من وراء اسحق یعقوب۔ فراء نے کہا: جر جائز نہیں مگر حرف جر کے اعادے کے ساتھ، سیبویہ نے کہا اگر آپ کہیں مررت بزيد أول من أمس وأمس عمرو تو یہ قبیح اور غلط ہوگا کیونکہ آپ نے مجرور اور جو اس کے ساتھ شریک ہے اور وہ واؤ ہے اس میں تفریق کر دی جس طرح آپ جار اور مجرور کے درمیان تفریق کرتے ہیں، کیونکہ جار اور مجرور کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی جار اور واؤ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝

''سارہ نے کہا: وائے حیرانی! کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے میاں ہیں یہ بھی بوڑھے ہیں، بلاشبہ یہ تو عجیب و غریب بات ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰوَیْلَتٰۤی زجاج نے کہا: اس کی اصل یا دیلتی ہے۔ یا کو الف سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ یا اور کسرہ سے زیادہ خفیف ہے، اس نے ویل کے ساتھ اپنے لیے بددعا کا ارادہ نہیں کیا بلکہ یہ ایک کلمہ ہے جو عورتوں کی زبان پر آتا ہے جب ان پر کوئی ایسی چیز طاری ہو جس سے وہ حیران ہوں، اور (سارہ) اس کی ولادت اور اپنے میاں کے بوڑھے ہونے کی وجہ سے حیران ہوئیں کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا، اور ہر وہ کام جو عادت سے خارج ہو وہ عجیب و غریب سمجھا جاتا ہے (1)۔ اور ءَاَلِدُ یہ استفہام ہے اس کا معنی تعجب ہے۔ وَاَنَا عَجُوْزٌ یعنی بوڑھی۔ ولقد عجزت تعجز عجزا و عجزت تعجیزا یعنی وہ بڑھاپے میں داخل ہوئی۔ اور عجوزۃ بھی کہا جاتا ہے۔ اور عجزت المراۃ جیم کے کسرہ کے ساتھ، (کہا جاتا ہے) جس کی سرین بڑھ جائے یہ عُجْزا اور عَجَزا دونوں طرح آتا ہے۔

مجاہد نے کہا: وہ ننانوے سال کی تھیں، ابن اسحاق نے کہا: وہ نوے سال کی تھیں، اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هٰذَا بَعْلِیْ یعنی میرا شوہر، شَیْخًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور اس میں عامل تنبیہ یا اشارہ ہے۔ وَّهٰذَا بَعْلِیْ مبتدا اور خبر ہے اخفش نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی کی قراءت میں وھذا بعلی شیخ ہے۔ نحاس نے کہا: جس طرح آپ کہتے ہیں: ھذا زید قائم۔ تو زید، ھذا سے بدل ہے اور مبتدا کی خبر کے قائم مقام ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھذا مبتدا اور زید قائم دونوں خبریں ہوں، سیبویہ نے حکایت کیا: ھذا حلو حامض اور کہا گیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک سو بیس سال کے تھے، ایک قول یہ ہے: سو سال کے تھے۔ مجاہد کے قول کے مطابق آپ حضرت سارہ سے ایک سال زائد عمر کے تھے، ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے قول وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا کے ذریعے عذر پیش کیا حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی اور ہاران بن ناحور بن شاروع بن ارغو بن فالغ کی بیٹی تھی، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی تھی۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ یعنی جس کی تم نے مجھے بشارت دی یہ عجیب و غریب بات ہے۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

''فرشتے کہنے لگے: کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ کے حکم پر؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے ابراہیم کے گھرانے والو! بے شک وہ ہر طرح تعریف کیا ہوا بڑی شان والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ جب اس نے کہا: وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 486

اور حیران ہوئی تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اس کی قضا اور تقدیر سے اس کے تعجب کو ناپسند کیا، یعنی اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو بچہ عطا فرمائے اور وہ حضرت اسحاق ہے۔ اس آیت سے بہت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہ حضرت اسحاق سے عمر میں بڑے ہیں، کیونکہ حضرت سارہ کو بشارت دی گئی کہ اسحاق زندہ رہیں گے یہاں تک کہ ان سے یعقوب پیدا ہوں گے۔ عنقریب اس بارے میں گفتگو آئے گی اور اس کا بیان سورۃ صافات میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ مبتدا ہے اور خبر علیکم ہے۔ سیبویہ نے اس کو عَلَيْكُمْ کاف کے کسرہ کے ساتھ بیان کیا ہے یا کی مجاورت کی وجہ سے۔ کیا یہ خبر ہے یا دعا؟ اس کا خبر ہونا زیادہ شرافت وفضیلت کا باعث ہے، کیونکہ یہ ان کے لیے رحمت اور برکت کے حصول کا تقاضا کرتی ہے، معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور برکت تم پر بھیجی اے اہل بیت، اور اس کا دعا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی امید کی جاتی ہے اور بعد میں حاصل نہ ہوا۔ اَهْلَ الْبَيْتِ کی نصب اختصاص کی وجہ سے ہے۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے، ایک قول یہ ہے کہ ندا کی وجہ سے (منصوب ہے)

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی کی بیوی اہل بیت میں سے ہے، اس نے اس بات پر دلالت کی کہ انبیاء کی ازواج اہل بیت میں سے ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾ (الاحزاب: 33) اور عنقریب یہ آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سلام کی انتہاء وَ بَرَكٰتُهٗ پر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں خبر دی۔ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ برکت سے مراد بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ ان برکات میں سے یہ بات ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین حضرت ابراہیم وسارہ کی اولاد تھے۔ مالک نے وہب بن کیسان ابی نعیم عن محمد بن عمرو بن عطا روایت کیا انہوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا، اس نے کہا: السلام علیك و رحمة الله و برکاته، پھر اس نے اس کے ساتھ کچھ اور اضافہ کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اور اس وقت آپ کی بصارت چلی گئی تھی۔ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: وہ یمنی جس نے آپ کو چھپا دیا تھا، لوگوں نے آپ کو اس کا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا: بے شک سلام برکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(1) انہوں نے فرمایا: میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے صحابہ کی جماعت میں تھا، میں نے کہا: السلام علیکم، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله بیس میرے لیے اور دس تیرے لیے۔ انہوں نے کہا: میں دوبارہ داخل ہوا، تو میں نے کہا: السلام علیکم و رحمة الله، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله و برکاته تیس میرے لیے اور بیس تیرے لیے۔ میں تیسری دفعہ داخل ہوا تو میں نے کہا، السلام علیکم و رحمة الله و برکاته تو آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمة الله و برکاته تیس میرے لیے اور تیس تیرے لیے۔ میں اور آپ سلام میں برابر

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، کیف السلام، جلد 2، صفحہ 350

ہیں۔ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ یعنی تعریف کیا گیا شان والا۔ ان دونوں کو ہم (قرطبی) نے اسماء حسنیٰ میں بیان کر دیا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

''پھر جب دور ہو گیا ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف اور مل گیا انہیں مژدہ تو وہ ہم سے جھگڑنے لگے قوم لوط کے بارے میں۔ بے شک ابراہیم بڑے بردبار، رحم دل (اور) ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس بات کو رہنے دیجئے، بے شک آ گیا تیرے رب کا حکم۔ اور ان پر آ کر رہے گا عذاب جو پھیرا نہیں جا سکتا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ یعنی خوف، ارتاع عن کذا کہا جاتا ہے جب وہ خوف زدہ ہو۔ نابغہ نے کہا:

فارتاعَ من صَوتِ کَلّابٍ فباتَ لهُ طوعَ الشَّوامِتِ من خوفٍ و من صَرَدِ

وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یعنی اسحاق اور یعقوب کی۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے اس کو بشارت دی کہ وہ قوم لوط پر عذاب لائیں گے اور یہ کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں۔ یُجَادِلُنَا یعنی یجادل رسلنا وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ وہ اس کے حکم سے اترے۔ اس مباحثہ کو حمید بن ہلال نے جندب عن حذیفہ روایت کیا ہے اور یہ اس لیے تھا کہ جب ان (فرشتوں) نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ (العنکبوت: 31) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس میں پچاس مسلمان ہوں تو تم ان کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں آپ نے کہا: چالیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: تیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: بیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: اگر اس میں دس ہوں یا پانچ؟ حمید کو شک ہوا۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ قتادہ نے کہا، اسی کے قریب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وہ قوم جس میں دس مسلمان بھی نہ ہوں اس میں کوئی بھلائی نہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس (قوم) میں ایک مسلمان ہو تو تم اسے ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بے شک اس میں لوط ہے۔ انہوں نے کہا: ہم جانتے ہیں جو اس میں ہے ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ عبدالرحمن بن سمرہ نے کہا وہ چار لاکھ تھے۔ ابن جریج نے کہا: قوم لوط کی بستیوں میں چالیس لاکھ لوگ تھے۔ اخفش اور کسائی کا موقف یہ ہے کہ یُجَادِلُنَا (مضارع) جادلنا (ماضی) کی جگہ میں واقع ہے۔ نحاس نے کہا: جب یہ لما کے جواب میں ہے تو لازم تھا کہ ماضی ہوتا، تو مضارع کو ماضی کے قائم مقام بنا دیا گیا جس طرح شرط کو مضارع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا واجب ہوتا ہے تو

ماضی کے صیغہ کو اس کے قائم مقام بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک اور جواب بھی ہے کہ یُجَادِلُنَا حال کی جگہ ہو یعنی اقبل یجادلنا یہ فراء کا قول ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ، ''لاواہ حلیم'' کا معنی سورۂ براءت میں گزر چکا ہے اور منیب کا معنی لوٹنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اناب جب وہ لوٹے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے: الاواہ سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اس بات پر افسوس کرتے ہوئے جو قوم لوط کے ایمان میں سے فوت ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی قوم لوط کے بارے میں بحث کو چھوڑیئے۔ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ یعنی اس کا عذاب ان کے لیے۔ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ یعنی ان پر نازل ہونے والا ہے۔ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ یعنی ان سے نہ ٹلنے والا اور نہ اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَيْفِیْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝

''اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس وہ دلگیر ہوئے ان کے آنے سے اور بڑے پریشان ہوئے ان کی وجہ سے اور بولے آج کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے اور (مہمانوں کی خبر سنتے ہی) آئے ان کے پاس ان کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اور اس سے پہلے ہی وہ کیا کرتے تھے برے کام۔ لوط نے کہا: اے میری قوم! (دیکھو) یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں پاک اور حلال ہیں تمہارے لیے تم خدا کا خوف کرو اور مجھے رسوا نہ کرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں، کیا تم میں ایک بھی سمجھ دار آدمی نہیں؟ کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ لوط نے (بصد حسرت) کہا: اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی۔ فرشتوں نے کہا: اے لوط! ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں

گے پس آپ لے کر نکل جائیے اپنے اہل وعیال کو جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی نہ دیکھے، مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جائیے۔ بے شک وہی (عذاب) اسے بھی پہنچے گا جو ان (دوسرے مجرموں) کو پہنچا۔ ان پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا نہیں صبح (بالکل) قریب؟ پھر جب آپہنچا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کی بلندی کو اس کی پستی اور ہم نے برسائے ان پر پتھر آگ میں پکے ہوئے پے در پے، جو نشان زدہ تھے آپ کے رب کی جانب سے اور نہیں (لوط کی) بستی (مکہ کے) ظالموں سے کچھ دور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ جب فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے نکلے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کے درمیان چار فرسخ (بارہ شرعی میل) کا فاصلہ تھا۔ (قوم) لوط کی دو بیٹیوں نے فرشتوں کو دیکھا اور وہ دونوں پانی بھر رہی تھی۔ اور ان دونوں نے خوبصورت شکل کو دیکھا۔ تو انہوں نے کہا: تم کون ہو؟ اور کہاں سے تم آئے؟ انہوں نے کہا: فلاں جگہ سے، ہم اس گاؤں کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اس کے رہنے والے فحش (کام کرنے والے) لوگ ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیا اس میں وہ شخص ہے جو ہمیں پناہ دے گا؟ انہوں نے کہا: ہاں، یہ شیخ ہے اور انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی ہیئت دیکھی تو آپ کو ان پر اپنی قوم (کی زیادتی) کا اندیشہ ہوا۔ سِیْٓءَ بِهِمْ یعنی ان کی آمد نے آپ کو پریشان کیا۔ کہا جاتا ہے: ساء یسوء تو یہ لازم ہوگا اور ساءہ یسوءہ تو یہ متعدی ہوگا۔ اور اگر آپ چاہیں تو سین کو ضمہ دے دیں کیونکہ اس کی اصل ضمہ ہے اور اصل میں یہ سوءے سوی بھم ہے، واؤ کی حرکت سین کی طرف منتقل کر دی گئی اور واؤ کو یا سے بدل دیا گیا اور اگر آپ ہمزہ کو شد نہ دیں تو اس کی حرکت یا کو دے دیں اور کہیں: سی بھم تخفیف کے ساتھ اور تشدید کے ساتھ بھی ایک شاذ لغت ہے۔ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا یعنی ان کے آنے کے سبب آپ کا دل تنگ ہوا اور آپ نے اسے ناپسند کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ کی وسعت اور طاقت تنگ ہوگئی۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اونٹ چلتے وقت اپنے اگلے پیروں سے اپنے قدموں کی گنجائش کی پیمائش کرے اور جب اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بار لادا جائے تو وہ اس سے تنگ ہوتا ہے کمزور ہوتا ہے اور اپنی گردن کو کھینچتا ہے۔ پس ضیق الذرع، ضیق الوسع سے عبارت ہوگا۔ اور کہا گیا: یہ ذرعه القئی سے ہے یعنی وہ غالب آگئی یعنی وہ کسی ناموافق چیز کو اپنے اندر روکنے سے تنگ ہوگیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا دل اس وجہ سے تنگ ہوا کہ آپ نے ان (فرشتوں) کی خوبصورتی کو دیکھا اور اس وجہ سے کہ آپ اپنی قوم کے فسق کو جانتے تھے۔ وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ یعنی شر میں سخت۔ شاعر نے کہا:

وانك إلّا ترضَ بكر بن وائلٍ   يكنْ لكَ يومٌ بالعراقِ عصِيبُ

''اور تو اگر بکر بن وائل کے ساتھ راضی نہ ہوا تو عراق میں تیرا دن بہت سخت ہوگا''۔

اور دوسرے نے کہا:

يومٌ عصِيبٌ يَعصِبُ الأبطالَا   عَصْبَ القوِيّ السَّلَمَ الطِّوالَا

اور کہا جاتا ہے: عَصِيبٌ اور عَصَبْصَبٌ کسی چیز کی کثرت کو ظاہر کرنا، یعنی ناگوار شر کا مجموعہ اور قد عصب (کہا جاتا ہے)

یعنی عصب بالشئ عصابة (جس سے مراد جماعت ہے) اس سے عصبة اور عصابة کہا جاتا ہے یعنی کلمہ کو جمع کرنے والے مراد اپنی ذات میں جمع کرنے والے ہیں۔ اور عصبة الرجل سے مراد اس کے ساتھ نسب میں جمع ہونے والے ہیں اور تعصبت لفلان یعنی میں اس کے عصبہ کی طرح ہو گیا۔ اور رجل معصوب سے مراد وہ آدمی ہے جس میں خلقت کا اجتماع ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ حال واقع ہو رہا ہے۔ یُهْرَعُوْنَ سے مراد یسرعون ہے یعنی وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ کسائی، فراء اور دیگر اہل لغت نے کہا: اهراع سے مراد ایسی تیزی ہے جس کے ساتھ خوف کی وجہ سے لاحق ہونے والی کپکپی ہو۔ کہا جاتا ہے: أهرع الرجل إهراعاً یعنی اس نے جلدی کی سردی، غصے یا بخار سے کپکپی میں (1)، وهو مهرع۔

مہلہل نے کہا:

فجاءوا یُهْرَعون وهُمْ أسارَی نَقودُهُمْ علی رَغْمِ الأُنوفِ

ایک اور شاعر نے کہا:

بمعجلاتٍ نحوه مَهارِعِ

اور یہ اسی طرح ہے جیسے أُولِعَ فلان بالأمر، أرعِد زید اور زُهی فلان ہے یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ أهرع سے مراد اهرعه حِرصُه ہے یعنی اس کے لالچ نے اس میں جلدی کی۔ اس بنیاد پر یهرعون سے مراد ہے کہ وہ اس پر ابھارتے ہیں اور جس نے پہلے قول کے مطابق بات کی ہے اس نے کہا: اس کو سوائے اهرع الرجل یعنی اسرع کے سنا ہی نہیں گیا، یعنی اس کو مجہول ہی بیان کیا گیا ہے۔ ابن قوطیہ نے کہا: هُرِعَ الانسان هَرَعا، وأُهرِعَ یعنی وہ چلا اور اس نے جلدی کی۔ ہروی نے کہا: هُرِعَ الرجل و أُهرِعَ کہا جاتا ہے یعنی اسے ابھارا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور سدی نے کہا: یهرعون بمعنی یهرولون ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ سعون کے معنی میں ہے۔ ابن عیینہ نے کہا: گویا کہ وہ دفاع کر رہے تھے۔ شمر بن عطیہ نے کہا: یہ تیز چلنے اور تیز دوڑنے کی درمیانی چال ہے۔ حسن نے کہا: دو چالوں کے درمیان کی چال ہے اور معنی قریب قریب ہے۔ ان کی تیزی کا سبب یہ تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی جب اس نے مہمانوں کو دیکھا اور ان کی خوبصورتی اور جمال کو دیکھا تو وہ نکلی یہاں تک کہ اپنی قوم کی مجلس میں آ گئی اور ان کو کہا کہ لوط علیہ السلام کے پاس آج رات ایسے نوجوان مہمان ہیں خوبصورتی میں ان جیسا نہیں دیکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔ تو اس وقت وہ تیز تیز آپ کی طرف آئے۔ اور ذکر کیا جاتا ہے کہ جب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے شہر پہنچے تو انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو کھیتی باڑی میں مصروف پایا۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی بیٹی کو نہر سدوم سے پانی بھرتے ہوئے پایا انہوں نے اس بیٹی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو ان کی ضیافت کرے بیٹی نے ان کی ہیئت کو دیکھا اور ان کے بارے میں قوم لوط سے ڈر گئی بیٹی نے کہا تم یہیں ٹھہرو، پھر اپنے باپ کی طرف گئی اور اسے خبر دی۔ تو انہوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آج رات آپ ہماری میزبانی کریں، آپ نے ان کو کہا: کیا تم نے اس قوم کے عمل کے بارے میں نہیں سنا؟

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 99

انہوں نے کہا: ان کا عمل کیا ہے؟ آپ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ زمین میں بدترین قوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمادیا تھا کہ انہیں عذاب نہ دینا یہاں تک کہ حضرت لوط علیہ السلام چار مرتبہ ان کے خلاف گواہی دیں۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے یہ گفتگو کی۔ جبریل علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو کہا: یہ ایک (مرتبہ گواہی) ہے اور کلام ان کے درمیان چلاحتی کہ حضرت لوط علیہ السلام نے چار مرتبہ گواہی کو مکرر فرمایا پھر ان کو لے کر شہر میں داخل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مِنْ قَبْلُ یعنی فرشتوں کے آنے سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے۔ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی مردوں کے ساتھ بدفعلی ان کی عادت تھی۔ جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کے مہمانوں کا قصد کیا تو حضرت لوط علیہ السلام دفاع کرتے ہوئے ان کی طرف گئے اور فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ آپ کے قول هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: آپ کی تین صلبی بیٹیاں تھیں، ایک قول ہے: دو بیٹیاں تھیں۔ زیتا اور زعوراء۔ ایک قول یہ ہے: ان کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی آپ نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: اس حالت میں آپ نے ان کو نکاح کا کہا اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ (ان کی شریعت میں) کافر کا نکاح مومن عورت کے ساتھ جائز تھا۔ یہ آغاز اسلام میں بھی جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے فرمایا وحی سے پہلے اور وہ دونوں کافر تھے۔ اور ایک گروہ، جس میں مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر ہیں نے کہا: آپ نے اپنے قول بناتی کے ذریعے تمام عورتوں کی طرف اشارہ کیا، کیونکہ قوم کا نبی ان کا باپ ہوتا ہے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے تقویت ملی ہے۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب: 6) وھو أب لھم یعنی نبی مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی ازواج (مطہرات) ان کی مائیں ہیں اور وہ (نبی) ان کا باپ ہے۔ ایک گروہ نے کہا: یہ کام مدافعانہ تھا اور آپ نے اس کو نافذ کرنے کا ارادہ نہ فرمایا تھا، یہ قول ابو عبیدہ سے مروی ہے جس طرح اس آدمی کو کہا جاتا ہے جسے غیر کا مال کھانے سے روکا جاتا ہے، خنزیر تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ حلال ہے۔ عکرمہ نے کہا: آپ نے ان پر اپنی اور اپنی امت کی بیٹیاں پیش نہیں کی تھیں بلکہ یہ انہیں اس لیے کہا تھا تاکہ وہ واپس لوٹ جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی میں تمہاری ان سے شادی کر دیتا ہوں، جو تم چاہتے ہو اس میں سے وہ تمہارے لیے طاہر ہیں یعنی حلال ہیں۔ تطہر سے مراد ایسی چیز سے بچنا ہے جو حلال نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح دیا تو آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

اطہر میں الف تفضیل کے لیے ہے کہ یہ وہم پیدا ہو کہ مردوں کے ساتھ نکاح کرنا طاہر ہے بلکہ یہ آپ کے اس قول کی طرح ہے: اللہ اکبر و اعلی و اجل یعنی اللہ سب سے بڑا، سب سے بلند اور سب سے اجل ہے اگرچہ یہ ازروئے تفضیل کے نہیں، یہ جائز ہے اور کلام عرب میں عام ہے اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے بڑا نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ بڑا ہو۔ ابو سفیان بن حرب نے غزوۂ احد والے دن کہا: اعل ھبل اعل ھبل یعنی ہبل (بت کا نام) بہت بڑا ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کہہ دو اللہ تعالیٰ اعلیٰ اور اجل ہے (1)۔ اور ھبل کبھی بھی بلند اور جلیل نہیں ہوا''۔ عام قراء نے را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن اور عیسیٰ بن عمرو نے ھن اطھر پڑھا حال کی وجہ سے نصب کے ساتھ ھن ضمیر عماد (فصل) ہے۔ خلیل، سیبویہ اور اخفش نے یہاں ھن کے عماد ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ ضمیر عاد اس صورت میں ہوتی ہے جس میں کلام اس کے مابعد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا جیسے کان زید ھو أخاك تاکہ اس کے ذریعے یہ استدلال کیا جاسکے کہ الاخ صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اور اس کے ذریعے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ کان کو خبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نے کہا: اس کے ذریعے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ خبر معرفہ ہوتی ہے یا جو معرفہ کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ یعنی تم میری توہین نہ کرو اور تم مجھے ذلیل نہ کرو۔ اسی سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ شعر ہے۔

فأخزاكَ ربي يا عتيبَ بن مالكٍ ولقاكَ قبل الموت إحدى الصَّواعق

مددتَ يمينًا للنبي تَعمُّدًا ودَمَّيْتَ فاهُ قُطِعتْ بالبَوارق

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خزایۃ سے ہو جس کا معنی حیا اور شرم ہے۔ ذوالرمۃ نے کہا:

خزاية أدركته بعد جولتِهِ من جانبِ الحبلِ مخلوطا بها الغضب

دوسرے شاعر نے کہا:

من البيضِ لا تَخزَى إذا الريحُ ألصقتْ بها مِرْطَها او زايلَ الحَلْيُ جِيدَهَا

ضیف کا اطلاق واحد ہونے کے باوجود تثنیہ اور جمع پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

لا تَعدمي الدهرَ شِفار الجازرِ لِلضيفِ والضيفُ أحق زائر

اس میں تثنیہ اور جمع بھی جائز ہے اور پہلا اکثر آتا ہے جس طرح کہ تیرا قول: رجال صوم و فطرٍ و زور روزہ دار آدمی، افطار کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے۔

اور خزی الرجل خزایۃ یعنی اس نے حیا کیا جس طرح کہ وہ ذلیل ہوا اور حقیر ہوا اور خزی خزیا کہتے ہیں جب کوئی رسوا ہو جائے، ان دونوں صورتوں میں مضارع تخزی ہی آتا ہے۔ پھر ان کو اپنے اس ارشاد کے ذریعے جھڑکا۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ یعنی سخت آدمی جو نیکی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، ایک قول یہ ہے: رشید، سے مراد ہدایت والا ہے۔ یا رشید بمعنی راشد یا بمعنی مرشد ہے یعنی صالح یا مصلح۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس سے مراد) مومن (ہے) ابو مالک نے کہا: برائی سے روکنے والا۔ ایک قول ہے: رشید بمعنی الرشد ہے۔ الرشد اور الرشاد سے مراد ہدایت اور استقامت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بمعنی مرشد ہو جس طرح حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 579

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ روایت ہے کہ قوم کے لوگوں نے آپ علیہ السلام کی بیٹیوں سے منگنی کی پس آپ نے ان کو رد کر دیا، اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جس عورت کی منگنی کو رد کر دیا ہو وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ مروی ہے کہ قوم لوط نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح بھیجا تو آپ نے انہیں رد کر دیا۔ پس کلام کی توجیہہ یہ ہوگی ہمارا تیری بیٹیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم نے ان کا قصد کیا ہے اور نہ ہی یہ ہماری عادت ہے کہ ہم اس کا مطالبہ کریں۔ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ مہمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً جب آپ نے ان کی گمراہی میں استمرار، اپنی کمزوری اور ان کے دفاع پر قادر نہ ہونے کو دیکھا تو تمنا کی کاش آپ ان کو روکنے کے لیے کسی مددگار کو پا لیتے، تو آپ نے گھبراہٹ اور عجز کے طور پر کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً یعنی انصار اور مددگار ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے آپ نے بیٹے کا ارادہ فرمایا۔ اور ان فعل مضمر کی وجہ سے محل رفع میں ہے جس کی تقدیر لو اتفق یا وقع ہے، اور یہ لو کے تابع آنے والے ان میں عام (قاعدہ) ہے۔ لو کا جواب محذوف ہے، یعنی لرددت اھل الفساد، یعنی میں فساد کرنے والوں کو ضرور ہٹا دیتا اور ان کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا۔ اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ یعنی میں پناہ لیتا اور مل جاتا۔ اَوْ اٰوِیَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قوۃ پر عطف کرتے ہوئے گویا کہ آپ نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیَ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ۝ یعنی ان آوی ہے۔ ان مضمرہ کے ساتھ یہ منصوب ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی رکن سے مراد خاندان اور کثرت کے ساتھ رکاوٹ اور دفاع کرنے والے ہیں۔ ان کے فعل کی قباحت نے آپ کو اس قول تک پہنچا دیا اس کے باوجود کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت سے واقف تھے۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ فرشتوں نے جب ان کلمات کے کہتے وقت آپ علیہ السلام پر (رنج وغم) کو پایا تو انہوں نے کہا: بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک وہ رکن شدید کی پناہ کی خواہش کرتے تھے'' (1)۔ الحدیث۔

سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو روایت کیا ہے (2) اور اس میں یہ اضافہ کیا ''اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر ان کی قوم کی ثروث میں''۔ محمد بن عمرو نے کہا: ثروت سے مراد کثرت اور قوت ہے، یہ حدیث حسن ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام پر ان کی قوم غالب آگئی اور انہوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اس حال میں کہ آپ اس کو روکے ہوئے تھے (اس وقت) فرشتوں نے آپ کو کہا: آپ دروازے سے ہٹ جائیے، آپ ہٹ گئے اور دروازہ کھل گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا تو ان کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھے ہو گئے اور الٹے پاؤں بھاگے یہ کہتے ہوئے: بچاؤ بچاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْیُنَهُمْ (القمر: 37) اور انہوں نے لوط کے مہمانوں کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام نے اپنا دروازہ بند کر دیا اور فرشتے آپ کے ساتھ گھر میں تھے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 478 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139

آپ اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور دروازے کے پیچھے سے انہیں قسمیں دلا رہے تھے اور وہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، جب فرشتوں نے ان کی طرف سے ملنے والی آپ علیہ السلام کی محنت، کرب اور تھکاوٹ کو دیکھا تو انہوں نے کہا: اے لوط! بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے، اور ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں، دروازہ کھول دیجئے اور ان کو اور ہم کو چھوڑ دیجئے۔ آپ نے دروازہ کھول دیا تو جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا جس طرح کہ گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے: جبریل علیہ السلام نے مٹھی بھر مٹی لی اور اس کو ان کے چہروں پر ڈال دیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کو قریب اور دور والوں کی آنکھوں تک پہنچا دیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں (بصارت) کو مٹا دیا، وہ رستے کو نہ پہچان سکے اور اپنے گھروں تک راہ نہ پا سکے اور کہنے لگے: بچاؤ بچاؤ بے شک لوط کے گھر ایسے لوگ ہیں جو روئے زمین پر سب سے زیادہ جادوگر ہیں۔ انہوں نے ہمارے اوپر جادو کر دیا اور ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اور کہنے لگے: اے لوط! جس طرح تو ہے یہاں تک کہ ہم صبح کریں تو تو دیکھ لے گا، وہ آپ کو دھمکیاں دینے لگے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ جب فرشتوں نے آپ علیہ السلام کی پریشانی، بے چینی اور مدافعت کو دیکھا تو انہوں نے آپ کو اپنا تعارف کرایا، پس جب آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ نے اپنی قوم کو داخلہ دے دیا۔ جبریل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر مارا پس وہ اندھے ہو گئے اور ان کے ہاتھوں پر مارا تو وہ خشک ہو گئے۔ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ یعنی کسی برائی کے ساتھ۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ اس کو فَاسْرِ بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہمزہ وصلی اور قطعی دونوں طرح، دونوں فصیح لغتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ⊙ (الفجر) اور فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى (بنی اسرائیل: 1) (پہلی آیت میں ہمزہ وصل جب کہ دوسری میں قطعی ہے)

نابغہ نے کہا: اس نے دونوں لغتیں جمع کر دیں ہیں:

أسرت عليه من الجوزاء ساريةٌ تزجي الشمالُ عليهِ جامدَ البَرَدِ

ایک اور شاعر نے کہا:

حَيِّ النَّضِيرَةَ رَبَّةَ الخِدْرِ أسْرَتْ إليكَ ولم تكُن تَسْرِي

یہ بھی کہا گیا ہے: فاسر ہمزہ قطعی کے ساتھ جب کوئی ابتدائی رات میں چلے اور سری جب کوئی رات کے آخری حصہ میں چلا ہو اور دن میں چلنے کے لیے صرف سار ہی آتا ہے۔ لبید نے کہا:

إذا المرءُ أسْرَى ليلةً ظنَّ أنَّهُ قَضَى عملاً والمرءُ ما عاش عامِلُ

جب آدمی رات کے ابتدائی حصہ میں چلتا ہے تو اس کا گمان ہوتا ہے کہ اس نے کام پورا کر لیا حالانکہ آدمی جب تک زندہ ہے کام کرنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

عند الصباحِ يَحْمَدُ القومُ السُّرَى وتَنْجلِي عنهم غَيَاباتُ الكَرَى

بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رات کا کچھ حصہ (1)۔ ضحاک نے کہا: رات کا بقیہ حصہ۔ قتادہ نے کہا: رات کا ابتدائی حصہ گزر جانے کے بعد کا حصہ۔ اخفش نے کہا: رات کے آجانے کے بعد۔ ابن اعرابی نے کہا: رات کی کسی گھڑی میں۔ ایک قول یہ بھی ہے: رات کی تاریکی میں۔ ایک قول یہ ہے: رات کے سکون کے بعد۔ ایک قول ہے: رات کا حصہ، یہ تمام قریب قریب ہیں، ایک قول یہ ہے: یہ رات کا نصف حصہ ہے، یہ قطعہ نصفین سے ماخوذ ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ونائحةٍ تَنوحُ بِقِطعِ ليلٍ على رجلٍ بقارعةِ الصَّعيدِ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سری کہتے ہیں رات کے وقت چلنے کو تو بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ نہ فرمایا ہوتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ یہ رات کے ابتدائی حصے میں ہوتا۔ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ یعنی تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے نہ دیکھے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا: تم میں سے کوئی بھی مال و اسباب میں سے جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے اس میں مشغول نہ ہو۔ إِلَّا امْرَأَتَكَ منصوب اور یہی قراءت معنی کے اعتبار سے واضح ہے، یعنی آپ رات کے وقت اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جایئے سوائے آپ کی بیوی کے فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ..... إِلَّا امْرَأَتَكَ اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ۔۔۔ إِلَّا امْرَأَتَكَ پس اہل سے اس کی استثنا ہے، اسی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ نہ نکلی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ (العنکبوت) یعنی باقی رہ جانے والوں میں سے۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے إِلَّا امْرَأَتُكَ، أَحَدٌ سے بدل کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے اس قراءت کا انکار کیا ہے جن میں سے ایک ابو عبید ہیں۔ انہوں نے کہا یہ صرف یلتفت کے رفع کے ساتھ صحیح ہے اور یہ صفت ہے کیونکہ ابدال اور جزم کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عورت کی طرف توجہ اور التفات مباح ہے حالانکہ معنی اس طرح نہیں۔ نحاس نے کہا: ابو عبید اور ان کے علاوہ ابو عمرو جیسے لوگوں کی جانب ان کی جلالت شان اور عربی میں ذی مرتبہ ہونے کے باوجود ایسا ہونا ضروری نہیں۔

أَحَدٌ سے بدل ہونے کی وجہ سے اس کو مرفوع پڑھنا صحیح ہے، اس کی تاویل وہ ہوگی جو محمد بن ولید نے محمد بن یزید سے بیان کی ہے کہ جس طرح آدمی اپنے دربان کو کہتا ہے: لا یخرج فلان، فلاں نہ نکلے، تو نہی کا لفظ تو فلاں کے لیے ہے جب کہ اس کا معنی مخاطب کے لیے ہے اس کا مطلب یہ ہوگا لا تدعہ یخرج یعنی تو اس کو اس حال میں نہ چھوڑ کہ وہ نکلے۔ اس کی مثل آپ کا یہ قول بھی ہے: لا یقم احد الا زید اس کا معنی یہ ہوگا: میں نے ان کو کھڑا ہونے سے منع کیا سوائے زید کے، تو اس طرح نہی تو حضرت لوط علیہ السلام کو ہے جب کہ اس کے الفاظ دیگر لوگوں کے لیے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے ان کو اس بات سے روکا ہے کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہے سوائے آپ کی بیوی کے، یہ بھی جائز ہے کہ اس کی استثنا التفات کی نہی سے ہو کیونکہ یہ مکمل کلام ہے پھر معنی یہ ہوگا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ پیچھے دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اسے لے کر نکلے تو آپ نے رات کے وقت اپنے ساتھ نکلنے والے ساتھیوں کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 111

پیچھے مڑ کر دیکھنے سے منع فرمادیا۔ تو سوائے آپ کی بیوی کے کسی نے بھی پیچھے نہ دیکھا، اس نے جب عذاب کی سخت آواز کو سنا تو پیچھے دیکھا اور کہا: وا قوماہ! پس ایک پتھر اسے آلگا اور اس نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا یعنی عذاب سے۔ اِنَّهٗ کی ہ ضمیر سے مراد الامر اور الشان ہے یعنی فان الامر والشان والقصة، مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ جب فرشتوں نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ (العنکبوت: 31) کہ ہم اس گاؤں کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: ابھی ابھی۔ یعنی اپنی قوم پر اپنے غصے کی وجہ سے ان سے جلدی عذاب کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے کہا: اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ کیا صبح قریب نہیں ہے۔ عیسیٰ بن عمرو نے اس کو الیس الصبح پڑھا ہے۔ ب کے ضمہ کے ساتھ، یہ بھی ایک لغت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کو ان کی ہلاکت گاہ بنایا ہو، کیونکہ اس (صبح کے وقت) میں زیادہ ٹھہرے ہوئے اور جمع ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام طلوع فجر کے وقت اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر نکلے تو آپ کے ساتھ ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو فرشتوں نے آپ کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گاؤں فرشتوں کے سپرد فرما دیا ہے جن کے ساتھ بادلوں کے گرجنے کی آواز، بجلی کا کوندنا اور بادلوں کے گرجنے کی سخت آوازیں ہیں اور ہم نے ان کو کہہ دیا ہے کہ عنقریب حضرت لوط علیہ السلام نکلیں گے لہٰذا تم انہیں تکلیف نہ دینا اور اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ پیچھے نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی ان کی بیٹیاں پیچھے دیکھیں گی لہٰذا (اے لوط) جو کچھ آپ دیکھیں وہ آپ کو خوف میں مبتلا نہ کرے۔ پس حضرت لوط علیہ السلام نکلے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر زمین کو لپیٹ دیا یہاں تک کہ آپ نے نجات حاصل کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا، اَمْرُنَا سے مراد عذابنا ہے، یعنی ہمارا عذاب۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا اور یہ اس طرح ہوا کہ جبریل علیہ السلام نے قوم لوط کی بستیوں کے نیچے اپنے پر داخل فرمائے۔ اور وہ (بستیاں) پانچ تھیں، سدوم، یہ سب سے بڑی بستی تھی۔ عامورا، دادوما، وضعوہ اور قتم۔ تو ان (بستیوں) کو زمین کی سرحدوں سے اتنا اوپر اٹھا لیا کہ وہ آسمان کے بالکل قریب ہو گئیں، یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے گدھوں کی رینگ اور ان کے مرغوں کی اذان سن لی، نہ کوئی گھڑا الٹا اور نہ کوئی برتن ٹوٹا پھر وہ اپنے سروں کے بل الٹے کر دیئے گئے اور ان پر پتھر برسائے۔ مقاتل نے کہا: چار (بستیوں) کو ہلاک کر دیا گیا اور ضعوہ بچ گئی۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے ان جیسا فعل کیا اس کا حکم رجم ہے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے اَمْطَرْنَا عذاب کے لیے اور مطرنا رحمت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک کلام عرب کا تعلق ہے تو اس میں مطرت السماء اور أمطرت السماء۔ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اس کو ہروی نے بیان کیا۔ سجیل کے بارے میں اختلاف ہے، نحاس نے کہا: سجیل (کا معنی) شدید اور کثیر ہے۔ سجیل اور سجین (دونوں ایک ہیں) لام اور نون اختین ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: سجیل سے مراد شدید ہے (1)، اس نے شعر کہا:

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 228

ضَرْبًا تَوَاصَى بِهِ الأَبْطَالُ سِجِّينًا

نحاس نے کہا: عبد اللہ بن مسلم نے اس کو رد کیا اور کہا: یہ سجین ہے جب کہ وہ سجیل ہے تو اس کے ذریعے کیسے استشہاد کیا جا سکتا ہے؟ نحاس نے کہا: یہ رد لازم نہیں آتا کیونکہ ابو عبیدہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قرب کی وجہ سے لام، نون سے بدلا ہوا ہے، البتہ ابو عبیدہ کے قول کا ایک اور طریقہ سے رد کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر یہ آپ کے قول کے مطابق ہوتا تو پھر حجارۃ سجیلا ہوتا کیونکہ حجارۃ من شدید نہیں کہا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ شدید اُصفت ہے۔ ابو عبیدہ نے فراء سے بیان کیا کہ ارحاء کے پتھر کو سجیل کہا جاتا ہے۔ محمد بن جہم نے ان سے حکایت کیا کہ سجیل ایسا کیچڑ ہے جسے پکایا جاتا ہے حتی کہ وہ اُرحاء کی طرح ہوتی ہے۔ ایک گروہ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور ابن اسحاق ہیں نے کہا کہ سجیل غیر عربی لفظ ہے جس کو معرب بنایا گیا ہے، اس کی اصل سنج وجیل ہے اس کو "سنک وکیل" بھی کہا جاتا ہے یعنی جیم کی جگہ کاف کے ساتھ، اور یہ دونوں فارسی میں پتھر اور مٹی ہیں۔ عربوں نے ان کو معرب بنایا اور ان دونوں کو ایک ہی نام بنا دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: سجیل سے مراد مٹی ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ (الذاریات) حضرت حسن نے کہا: پتھروں کی اصل مٹی تھی پھر وہ سخت کر دیئے گئے۔ عربوں کے نزدیک ہر سخت چیز سجیل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد پکی اینٹیں ہیں۔ ابن زید نے کہا: ایسی مٹی جس کو پکایا گیا ہو حتی کہ وہ پکی ہوئی اینٹ کی طرح ہو جائے۔ انہی سے روایت ہے کہ سجیل آسمان دنیا کا نام ہے۔ اس کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی نے ابو العالیہ سے اس کو بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ منضود کے ساتھ اس کی صفت کا آنا اس کو رد کر دیتا ہے، عکرمہ سے ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے درمیان ہوا میں معلق سمندر ہے جس سے پتھر نازل ہوئے۔ ایک قول یہ ہے: یہ آسمان میں پہاڑ ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے اشارہ فرمایا: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور: 43) ایک قول یہ ہے کہ یہ سجل سے مشتق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دیا جو ان کو پہنچے گا۔ پس یہ سجین کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (مطففین) یہ زجاج کا مختار قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ اسجلتہ سے فعیل کا وزن ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے چھوڑ دیا، گویا کہ وہ ان پر چھوڑی گئی چیز کی مثل تھے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ اسجلتہ سے مشتق ہے جب آپ کسی کو کوئی چیز عطا کریں (تو یہ بولا جاتا ہے) گویا کہ یہ عذاب تھا جو ان کو دیا گیا تھا، (شاعر) نے کہا:

مَنْ يُسَاجِلْنِي يُسَاجِلْ مَاجِدًا يَمْلَأُ الدَّلْوَ إِلَى عَقْدِ الكَرَبِ

اہل معانی نے کہا: پتھر اور مار میں سے جو چیز سخت ہو اسے سجیل اور سجین کہتے ہیں۔ ابن مقبل نے کہا:

وَرَجْلَةٍ يَضْرِبُونَ البَيْضَ ضَاحِيَةً ضَرْبًا تَوَاصَى بِهِ الأَبْطَالُ سِجِّينَا

مَّنْضُوْدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس کا معنی ہے) پے در پے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے کسی چیز کا ایک دوسرے کے اوپر رکھنا۔ ربیع نے کہا: ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھا گیا یہاں تک کہ وہ ایک جسم ہو گئی۔ عکرمہ نے کہا:

(منضود بمعنی) مصفوف ہے، بعض نے کہا: بمعنی مرصوص ہے دونوں کا معنی قریب قریب ہے۔ نضدت المتاع والدین فھو منضود و نَضِیدٌ و نَضَدٌ کہا جاتا ہے جب آپ کسی چیز کو دوسری چیز پر رکھیں۔ (شاعر نے) کہا:

ورَفَّعَتْهُ إلى السَّجفَيْنِ فالنَّضَدِ

ابوبکر ہذلی نے کہا: (اس سے مراد) تیار شدہ ہے یعنی یہ اس عذاب میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ظالم دشمنوں کے لیے تیار فرما رکھا ہے۔ مُّسَوَّمَةً یعنی نشان زدہ یہ سیما سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، یعنی ان پر مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک قول یہ ہے: ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کو اس نے مارنا تھا۔ یہ زمین کے پتھروں سے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ فراء نے کہا: انہوں نے گمان کیا کہ سفیدی میں ان پتھروں پر سرخ اور سیاہ خطوط بنے ہوئے تھے پس یہی ان کی تسویم تھی۔ کعب نے کہا، ان پر سفید اور سرخ نشان لگے ہوئے تھے۔ شاعر نے کہا:

غلامٌ رماه اللهُ بالحسنِ یافِعًا له سِیمیَا لا تَشُقُّ علی البَصَرْ

مُّسَوَّمَةً، حِجَارَةً کی صفت ہے اور مَّنْضُوْدٍ، سِجِّيْلٍ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: عِنْدَ رَبِّكَ میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ زمین کے پتھروں میں سے نہیں تھے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ اس سے مراد قوم لوط ہے یعنی یہ سزا ان سے دور نہ تھی۔ مجاہد نے کہا: اس سے کفار قریش کو ڈرایا ہے معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پتھر (سزا) تیری قوم کے ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اس امت کے ظالم ہیں۔ قسم بخدا ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ نے کسی ظالم کو نہ بچایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ مرد مردوں سے جنسی لذت حاصل کریں گے اور عورتیں عورتوں سے اور جب ایسا ہو تو تم قوم لوط کے عذاب کا انتظار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ان پر سجیل کی کنکریاں برسائے گا''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ ایک اور روایت میں ہے۔ ''دن اور رات کا سلسلہ چلتا رہے گا حتی کہ اس امت کے مرد، مردوں کی پشت کو حلال کرلیں گے جیسا کہ انہوں نے عورتوں کی پشت کو حلال کرلیا ہے پھر امت کے ان لوگوں پر تیرے رب کی طرف سے سنگ باری ہوگی''۔ ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ یہ بستیاں ظالموں سے دور نہیں ہیں اور یہ شام اور مدینہ کے درمیان ہیں۔ ببعید اس وجہ سے مذکر آیا ہے کہ یہ بمکان بعید کے معنی میں ہے۔ پتھر برسانے کے بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھایا تو ان پر پتھر برسائے گئے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے جو اس وقت بستیوں میں نہ تھے بلکہ بستیوں سے باہر تھے۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝۸۴ وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا
أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ
أَنْ نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۖ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ﴿٨٧﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَءَيْتُمْ
إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ
إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُّصِيبَكُمْ مِّثْلُ مَا
أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ وَ
اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَّدُودٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ
كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنْتَ
عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ
ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ
سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ يَّأْتِيهِ عَذَابٌ يُّخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ
رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ
الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا
بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

"اور اہل مدین کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر اور نہ کمی کیا کرو ناپ اور تول میں، میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم خوشحال ہو اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اس دن کا عذاب نہ آجائے جو ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اور اے میری قوم! پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیئے سے وہی بہت ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان دار ہو۔ اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان، قوم نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں (ازراہ تمسخر بولے) بس تم ہی ایک دانا (اور) نیک چلن رہ گئے ہو۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خود

تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں (نیز) نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے اور نہیں میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم! ہرگز نہ اکسائے تمہیں میری عداوت (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر) مبادا پہنچے تمہیں بھی ایسا عذاب جو پہنچا تھا قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے۔ وہ بولے: اے شعیب! ہم نہیں سمجھ سکتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے اور اگر تمہارے کنبہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا اور نہیں ہو تم ہم پر غالب۔ آپ نے فرمایا: اے میری قوم! کیا میرا کنبہ زیادہ معزز ہے تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے۔ اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت۔ بے شک میرا رب جو عمل تم کرتے ہو (اس کو اپنے علم سے) احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر (اور) میں (اپنے طور پر) عمل پیرا ہوں۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور جب آپہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) تو ہم نے بچا لیا شعیب کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے اور آلیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے تو صبح کی انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے۔ گویا کبھی وہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ہلاکت ہو مدین کے لیے جیسے ہلاک ہو چکے تھے ثمود"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا یعنی وارسلنا الی مدین ہم نے مدین کی طرف بھیجا، مدین حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مدین کہا گیا ہے جب کہ مراد بنو مدین ہیں۔ جس طرح مضر کہا جاتا ہے اور مراد بنو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ان کے شہر کا نام ہے اس لیے اس کی طرف ان کو منسوب کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: مدین غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ شہر کا نام ہے، سورۂ اعراف میں یہ معنی گزر چکا ہے اور کچھ اس سے زیادہ بھی۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اس کی تفسیر) گزر چکی ہے۔ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ وہ اپنے کفر کے ساتھ کم تولنے والے تھے جب ان کے پاس کوئی کھانے کا سامان وغیرہ بیچنے والا آتا تو زائد وزن کے ساتھ اس سے لیتے، اپنی استطاعت کے مطابق وہ انتہائی وزن پورا کرتے اور ظلم کرتے تھے اور اگر کوئی کھانے کا سامان خریدنے کے لیے آتا تو وہ اس کو کم وزن کے ساتھ بیچتے اور اس کے ساتھ بخل کرنے میں انتہائی کوشش کرتے، تو انہیں شرک کا قلع قمع کر کے ایمان لانے اور کم تولنے سے روک کر پورا وزن دینے کا حکم دیا گیا۔ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ رزق میں وسعت اور نعمتوں کی کثرت مراد ہے۔ حضرت حسن نے کہا: ان کا بھاؤ سستا تھا (1)۔ وَ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 119

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ اللہ تعالیٰ نے یوم کی صفت احاطہ کے ساتھ بیان فرمائی حالانکہ اس دن کی احاطہ کے ساتھ صفت سے مراد ان (کفار) کا احاطہ ہے، کیونکہ عذاب کا دن جب ان کا احاطہ کرے گا تو عذاب ان (کفار) کا احاطہ کرلے گا یہ آپ کے قول یوم شدید کی طرح ہے یعنی وہ دن جس کی گرمی سخت ہوگی۔ اس عذاب کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ آخرت میں جہنم کا عذاب ہے اور ایک قول ہے کہ یہ دنیا میں استیصال کا عذاب ہے(1) جب کہ ایک قول ہے کہ بھاؤ بلند ہو جانے (کا عذاب) ہے اس کا یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے ''ناپ اور تول میں جس قوم کا بھی کمی کرنا ظاہر ہوا اللہ تعالیٰ نے ان کو قحط اور مہنگائی میں مبتلا کردیا''(2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ کم تولنے سے روکنے کے بعد تاکید اً پورا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ ایفا سے مراد پورا کرنا ہے۔ بِالْقِسْطِ یعنی عدل اور حق کے ساتھ اور مقصود یہ ہے کہ ہر حصہ دار کو اس کا حصہ مل جائے کیل یا وزنی چیز کو پورا کرنا مراد نہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا: اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بلکہ مراد یہ ہے کہ معہود اور معین چیز کے حجم کو کم نہ کرو اسی طرح صنجات ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ یعنی جتنی چیز کے لوگ مستحق ہیں تم ان کو اس سے کم نہ دو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ ناپ، تول میں خیانت کرنا زمین میں فساد برپا کرنے تک پہنچا دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس سے کچھ مزید گزر چکا ہے۔ اور ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی عدل کے ساتھ حقوق کو پورا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کو باقی رکھا ہے وہ از روئے برکت کے زیادہ ہے اور ظلم وجبر کے ذریعے ناپ تول میں کمی کرکے جو کچھ تم اپنے لیے بچا لیتے ہو اس سے انجام کے اعتبار سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کا یہ معنی طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ سے مراد اس کی اطاعت ہے(3)۔ ربیع نے کہا: (اس سے مراد) اللہ کی وصیت ہے۔ فراء نے کہا: اللہ کی نگرانی (مراد ہے) ابن زید نے کہا: اللہ کی رحمت، قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: تمہارے رب کی طرف سے تمہارا حصہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے(4)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کا رزق تمہارے لیے بہتر ہے(5)۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ شرط لگائی گئی کیونکہ وہ اس کی صحت کو تبھی جان سکتے ہیں جب وہ ایماندار ہوں۔ ایک قول یہ ہے: یہ احتمال بھی ہے کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے تو ان کو یہ خطاب فرمایا: وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی ایسا نگران جو تمہارے ناپ تول کے وقت تمہاری نگرانی کرتا ہو یعنی تمہاری طرف سے ہونے والے ہر معاملہ کو دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں حتی کہ میں حق کو پورا کرنے کے لیے تمہیں پکڑوں۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ میں اس بات پر تیار نہیں ہوں کہ تمہاری نافرمانی کی وجہ سے تمہارے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمتوں کو زائل ہونے سے بچالوں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 121 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ اس کو اَصَلٰوتُكَ مفرد بھی پڑھا گیا ہے۔ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ ان محل نصب میں ہے۔ کسائی نے کہا: با کے مضمر ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے (1) اور عبادات پر مواظبت اختیار کرنے والے تھے خواہ فرائض ہوں یا نوافل اور آپ کہتے: نماز تمہیں بے حیائی کے کاموں اور گناہ سے روکتی ہے، جب آپ نے ان کو حکم دیا اور ان کو روکا تو انہوں نے نماز کی کثرت پر آپ کے استمرار کو دیکھ کر نکتہ چینی کی اور آپ کا مذاق اڑایا، انہوں نے کہا: اللہ نے ان کے بارے میں خبر نہیں دی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ بمعنی قراءت ہے (2)۔ یہ سفیان نے اعمش سے نقل کیا ہے، یعنی تیری قراءت تجھے حکم دیتی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ کافر تھے۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا نماز اور زکوٰۃ کو اس پر فرض کیا ہے (3)۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ فراء کا گمان ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: ''او تنھانا ان نفعل فی اموالنا ما نشاء'' سلمی اور ضحاک بن قیس نے أو ان تفعل فی اموالنا ما تشاء دونوں فعلوں میں تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: اے شعیب جو تو چاہتا ہے۔ نحاس نے کہا: اس قراءت کے مطابق أو أن کا پہلے أن پر عطف ہوگا۔ زید بن اسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا وہ ان دراہم کو کناروں سے کاٹنا ہے (4)۔

ایک قول یہ ہے: اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا معنی یہ ہے جب ہم کم تولنے پر باہم رضامند ہیں تو تو ہمیں اس سے کیوں روکتا ہے؟ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ان کی مراد یہ ہے کہ بزعم خویش (تم دانا اور نیک چلن ہو) ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان) میں ابوجہل کی صفت بھی اسی کی مثل ہے یعنی بزعم خویش۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو یہ ازراہ استہزاء و تمسخر کہا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ اسی (قبیل) سے ہے ان کا حبشی کو، ابو البیضاء کہنا (سفیدی کا باپ) اور سفید رنگ والے کو أبو الجون (سیاہی کا باپ) کہنا۔ اور اسی سے جہنم کے داروغوں کا ابوجہل کے لیے یہ قول ہے۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان)

سفیان بن عیینہ نے کہا: عرب بعض اوقات کسی چیز کو اس کی ضد کے ساتھ متصف کرتے ہیں بدشگونی اور فال پکڑنے کے لیے۔ جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم اور فلاۃ (صحرا) کو مفازۃ (جنگل)، ایک قول یہ ہے: یہ تعریض ہے اس سے ان کی مراد گالی تھی۔ اور ان سب میں بہترین (تاویل) جس کی صحت پر ماقبل بھی دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ تم حقیقتاً دانا اور نیک چلن ہو تو تم ہمیں کیسے حکم دیتے ہو کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اس پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ جب انہوں نے آپ کی عبادت اور نماز کی کثرت کو دیکھا اور اس بات کو دیکھا کہ آپ دانا اور نیک چلن ہیں تو انہوں نے اس بات کا انکار کر دیا کہ آپ کو ان (بتوں) کو چھوڑ دینے کا حکم دیں گے جن کی عبادت ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ اور اس کا مابعد بھی اسی پر دلالت کرتا ہے یعنی قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا یعنی کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں؟ یہ سارے کا سارا اس بات

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 200 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 123

پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہ حقیقتاً کہا اور وہ آپ کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ معنی بنو قریظہ کے یہودیوں کی اس بات کی طرح ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہی جب آپ نے ان کو یا إخوة القردة(1) (اے بندروں کے بھائیو) کہا، تو انہوں نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم آپ کو جاہل نہیں سمجھتے تھے۔

مسئلہ۔ اہل تفسیر نے کہا: ان کو دراہم و دنانیر کو کاٹنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا(2)۔ اور اسی کام سے انہیں منع کیا گیا تھا وہ صحیح (دراہم و دنانیر) کی اطراف کو قینچی سے کاٹ لیتے تھے تاکہ کٹا ہوا حصہ ان کو بچ جائے۔ صحیح (دراہم و دنانیر) کے ساتھ گن کر جب کہ کٹے ہوؤں سے وزن کر کے باہم معاملات کرتے تھے اور وزن میں کمی کر دیتے تھے۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک نے کہا ہے: وہ دراہم و دنانیر کو توڑتے تھے(3)۔ متقدمین مفسرین کی ایک جماعت نے بھی یوں ہی کہا ہے(4) جن میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت زید بن اسلم وغیرہ ہیں اور ان دونوں (دراہم و دنانیر) کا توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت علقمہ بن عبداللہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اس نے کہا: بغیر حرج کے مسلمانوں میں چلنے والے سکے کو توڑنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، کیونکہ جب تک یہ صحیح ہو تب تک اس کا مقصود بھی موجود ہے اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے اور جب اس کو توڑ دیا جائے تو یہ سامان (کی طرح) بن جاتا ہے اور اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے پس یہی چیز لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے لہٰذا یہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ (النمل) کی تاویل میں کہا گیا ہے کہ وہ دراہم کو توڑتے تھے۔ یہ زید بن اسلم کا قول ہے۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: لوگوں کا گمان ہے کہ مدینہ میں محمد بن کعب قرظی کے بعد حضرت زید بن اسلم سے زیادہ تاویل قرآن کو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔

مسئلہ۔ اصبغ نے کہا حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم بن خالد بن جنادہ(5) جو زید بن حارث عتقی کا غلام تھا نے کہا: جس نے اس (دراہم) کو توڑا اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور اگر اس نے جہالت کا عذر پیش کیا تو یہ اس کا عذر نہ ہوگا اور یہ محل عذر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا کہ جہاں تک ان کے قول: لم تقبل شهادته(6) (اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی) کا تعلق ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اور کبیرہ گناہ عدالت کو ساقط کرتے ہیں جب کہ صغیرہ گناہ عدالت کو ساقط نہیں کرتے اور رہا ان کا قول کہ اس سلسلہ میں جہالت کا عذر قابل قبول نہیں تو یہ تو ایک واضح معاملہ ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں اور عذر تو صرف اس صورت میں قابل قبول ہوتا ہے جس میں صدق ظاہر ہو یا صدق کا سبب پوشیدہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ تو اس کو بندے کی نسبت زیادہ جانتا ہے جس طرح کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا۔

مسئلہ۔ جب یہ (قطع دراہم) ایسی نافرمانی اور فساد ہے جس کی وجہ سے شہادت رد کر دی جاتی ہے تو جو شخص ایسا کرے اس کو سزا بھی دی جائے گی۔ حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جسے کوڑے مارے گئے تو آپ

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 35
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 122
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1064
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً

نے کہا: یہ کیا ہے؟ آدمی نے کہا: یہ دنانیر اور دراہم کو کاٹتا ہے، حضرت ابن مسیب نے کہا: یہ تو زمین میں فساد ہے (1) اور آپ نے اس کی کوڑوں (کی سزا) کا انکار نہ کیا، اسی طرح کا واقعہ سفیان سے بھی مروی ہے، ابوعبدالرحمٰن تجیبی نے کہا: میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا وہ اس وقت امیر مدینہ تھے تو آپ کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جو دراہم کو کاٹتا تھا اس کے خلاف شہادت قائم ہو چکی تھی تو آپ نے اس کو مارا، اس کا حلق کیا اور اسی حالت میں اس کو چکر لگوانے کا حکم دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ (چکر لگوانے والا) یہ کہے: یہ ہر اس آدمی کی سزا ہے جو دراہم کو کاٹتا ہے، پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو آپ کے پاس واپس لایا جائے، تو آپ نے فرمایا: مجھے تیرا ہاتھ کاٹنے میں صرف یہ مانع ہے کہ آج کے دن سے پہلے میں نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کی، اس سلسلہ میں اب میں نے پہل کر دی ہے پس جو چاہے قطع ید بھی کرے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا (2): کوڑے کے ذریعے آپ کے ادب سکھانے میں تو کوئی کلام نہیں جہاں تک حلق کرنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں مارتا تھا اور حلق کرتا تھا اور میں ہر اس آدمی کے ساتھ ایسا کرتا رہوں گا جو اپنے بالوں کو نافرمانی پر معاون اور فساد کے سلسلہ میں ان کے ذریعے خوبصورتی کے حصول کا ذریعہ سمجھے گا۔ اور یہ (بالوں کا) کاٹنا نافرمانی کے ہر اس طریقے میں لازم ہے جو بدن میں غیر موثر ہو اور جہاں تک اس کا ہاتھ کاٹنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے چوری کے باب سے لیا ہے اور یہ سزا دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ہو نہ کہ ان کو توڑنے کی وجہ سے کیونکہ توڑنا تو وصف میں فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے جب کہ کاٹنا اس کی مقدار میں کمی کرنے کے مترادف ہے۔ تو یہ خفیہ طور پر مال لینا ہی ہوگا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے: کیا قطع ید کے سلسلہ میں حرز اصل نہیں؟ تو ہم نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خیال کرتے ہوں کہ مخلوق کے درمیان دینار یا درہم میں فرق کرنے کے لیے ان کی بناوٹ ہی ان کے لیے حرز ہے۔ اور ہر چیز کا حرز اس کی حالت کے مطابق ہوتا ہے اس کو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نافذ کیا اور آپ نے دنانیر اور دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ایک آدمی کا ہاتھ کاٹا۔ ہمارے مالکی علماء نے کہا (3): بے شک دنانیر و دراہم پر اللہ تعالیٰ کے نام کی مہریں ہیں اگر اہل تاویل کے قول کے مطابق اللہ کی مہر کو توڑنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ اس کا اہل تھا اور جس نے بادشاہ کے نام والی مہر کو توڑا تو اسے تادیبا سزا دی جائے گی۔

ابن عربی نے کہا: میرا خیال ہے کہ قطع ید دراہم کو کاٹنے کے سبب سے ہوگا ان کو توڑنے کی وجہ سے نہیں۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں یہی کرتا رہا ہوں مگر یہ کہ میں جہال کے ساتھ گھرا رہا۔ میں نے گمراہ حاسدین کی گفتگو کے سبب اس میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا پس اہل حق میں سے جو ایسا کر سکتا ہے اس کو اللہ سے اجر و ثواب کی امید کرتے ہوئے ایسا کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ یہ گزر چکا ہے۔ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا یعنی کھلا اور حلال۔ حضرت شعیب علیہ السلام کثیر المال شخص تھے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے۔ ایک قول یہ ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1064 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1065 3۔ ایضاً

اس سے مراد ہدایت وتوفیق اور علم ومعرفت ہے۔ کلام محذوف بھی ہے، یعنی افلا انھکم عن الضلال (کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں) ایک قول یہ ہے: اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ کا معنی یہ ہے کہ کیا میں گمراہی کی اتباع کروں؟ ایک قول یہ ہے: اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ کا معنی ہے کہ کیا تم مجھے کم تولنے اور کسی کا حق گھٹانے کے سلسلہ میں نافرمانی کا حکم دیتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے غنی فرمادیا ہے؟ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ، اُرید کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ یعنی میں ایسا نہیں کرتا کہ تم کو کسی کام سے روکوں اور خود اس کا ارتکاب کروں جس طرح میں اس کام کو چھوڑتا نہیں ہوں جس کو کرنے کا تمہیں حکم دوں۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ یعنی میں اصلاح کے کام کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ (میں یہ چاہتا ہوں) کہ تم عدل کے ذریعے اپنی دنیا کی اور عبادت کے ذریعے اپنی آخرت کی اصلاح کرلو۔

اللہ تعالیٰ نے مَا اسْتَطَعْتُ فرمایا کیونکہ کوئی کام سرانجام دینے کی شرط استطاعت ہے صرف ارادہ نہیں۔ ما مصدریہ ہے یعنی میں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اصلاح چاہتا ہوں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ یعنی میری ہدایت، توفیق سے مراد ہدایت ہے اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے بھروسا کیا۔ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ یعنی اپنے اوپر یہ تمام مصائب آنے کی صورت میں (اسی کی طرف) لوٹتا ہوں۔ ایک قول یہ ہے: آخرت میں اسی کی طرف لوٹوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ انابت سے مراد دعا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اسی کی خاطر میں دعوت دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَیٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ یحییٰ بن وثاب نے یُجْرِمَنَّكُمْ پڑھا ہے۔ شِقَاقِیْۤ محل رفع میں ہے۔ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ محل نصب میں ہے، یعنی میری دشمنی تمہیں ایمان کو ترک کرنے پر نہ ابھارے ورنہ تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو تم سے پہلے کفار کے ساتھ ہوا یہ حضرت حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

یَجْرِمَنَّكُمْ کا معنی سورۂ مائدہ، شقاق اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ عداوت کے معنی میں ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ اسی سے اخطل کا یہ قول ہے:

اَلَا مَنْ مُبْلِغٌ عَنِّیْ رسولا فکیف وجدتم طعم الشِّقَاقِ

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ شقاقی کا معنی اضراری ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی (فراق) میری جدائی ہے۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قوم لوط کی ہلاکت کے زمانے کے قریب تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ قوم لوط کے گھر تم سے دور نہیں (1) اصل میں بمکان بعید ہے اسی وجہ سے بعید کو واحد ذکر کیا گیا۔ کسائی نے کہا: یعنی ان کے گھر تمہارے گھروں میں (سے دور نہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ یہ اللہ سبحانہ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ہم (قرطبی) نے ان کو اپنی کتاب الاسنی فی شرح الاسماء الحسنی میں بیان کیا ہے۔ جوہری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202

نے کہا: جب آپ کسی کے ساتھ محبت کریں تو کہتے ہیں "وددت الرجل اودہ ودا" اور الودود سے مراد محبت کرنے والا ہے الوَد، الوِد، الوُد اور الموَدۃ کا معنی محبت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جب شعیب علیہ السلام کا ذکر ہوتا تو آپ فرماتے: "وہ انبیاء کے خطیب ہیں" (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ یعنی ہم نہیں سمجھتے، کیونکہ آپ بعث بعد الموت اور دوبارہ اٹھائے جانے میں سے غائب امور پر ہمیں ابھارتے ہیں اور آپ ہمیں ایسی نصیحتیں کرتے ہیں جیسی نصیحتوں کا ہمارے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے آپ کا کلام سننے سے اعراض برتتے ہوئے اور اسے حقیر سمجھتے ہوئے یہ بات کہی، فقه، یفقه کہا جاتا ہے جب کوئی فقہ کو سمجھے۔ کسائی سے فَقُه فَقْهًا اور فِقْهًا حکایت کیا گیا ہے جب کوئی فقیہ بن جائے۔

وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ نے کہا کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی بصارت کو مسئلہ تھا (2)۔ امام ثوری نے کہا: کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی نظر کمزور تھی (3)، ان سے نحاس نے حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ کے قول کی مثل قول بیان کیا۔ نحاس نے کہا: اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ حِمیر اندھے کو ضعیف کہتے ہیں یعنی اس کی بصارت جانے کی وجہ سے وہ ضعیف ہو گیا، جس طرح کہ اس کو ضریر کہا جاتا ہے یعنی اس کی بینائی جانے کے سبب اس کا نقصان ہو گیا۔ اسی طرح اس کو مکفوف بھی کہا جاتا ہے یعنی بینائی جانے کی وجہ سے وہ دیکھنے سے رک گیا۔ حضرت حسن نے کہا: اس کا معنی ضعیف البدن ہے یہ معنی علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ سدی نے کہا: ضعیفا کا معنی وحیداً ہے یعنی اکیلا یعنی آپ کے پاس وہ لشکر اور معاون نہیں جن کے ذریعے آپ ہماری مخالفت کر سکیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد دنیا کے مصالح اور اہل دنیا کی سیاست کی معرفت کی کمی ہے۔ ضَعِیْفًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، آدمی کے رہط سے مراد وہ خاندان ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے اور جن کے ذریعے اسے تقویت ملتی ہے۔ اسی سے الراھطاء ہے جو کہ چوہے کے بل کو کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے وہ اعتماد حاصل کرتا ہے اور اسی میں اپنے بچوں کو چھپاتا ہے۔ لَرَجَمْنٰكَ یعنی ہم رجم کے ذریعے آپ کو قتل کر دیں گے وہ جب کسی آدمی کو قتل کرتے تو اسے پتھروں کے ساتھ رجم کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے رہط ان کی ملت کے لوگ تھے ایک قول یہ ہے: لَرَجَمْنٰكَ کا معنی ہے کہ ہم آپ کو برا بھلا کہیں گے۔ اس سے جعدی کا یہ قول ہے:

تراجمنا بمُرّ القول حتیٰ نصیر کاننا فرسا رھانِ

رجم کا معنی لعنت بھی ہے اسی وجہ سے شیطان کو رجیم کہا جاتا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ یعنی آپ ہمارے اوپر غالب آنے والے نہیں نہ ہی جبر کرنے والے اور نہ روکنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ، اَرَهْطِیْۤ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کیا تمہارے دلوں میں میرا قبیلہ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اللہ سے زیادہ معزز ہے، زیادہ عزت والا اور زیادہ برتر ہے حالانکہ وہ تمہارا مالک ہے؟

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 568	2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202	3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 126

وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا یعنی اللہ کے احکام میں سے (1) جو میں تمہارے پاس لایا ہوں انہیں تم نے پس پشت ڈال دیا ہے، تم نے انہیں اپنی پیٹھوں کے پیچھے ڈال دیا ہے، اور میری قوم کے ڈر سے تم مجھے قتل کرنے سے رک گئے ہو۔ جب کوئی آدمی کسی کام میں کوتاہی کرے تو جعلت أمرہ بظھرۃ کہا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ان کے کرتوتوں سے مراد کفر اور معصیت وغیرہ ہیں۔ مُحِيْطٌ، مُحِيْطٌ بمعنی علیم ہے یعنی وہ جاننے والا ہے ایک قول کے مطابق محیط بمعنی حفیظ حفاظت کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ ارشاد گزر چکا ہے۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ یعنی کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے ہلاک کردے گا؟ من محل نصب میں ہے جیسے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ:220) وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ معطوف علیہ ہے اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ عنقریب تم جان لوگے کہ ہم میں سے جھوٹا کون ہے؟ ایک قول یہ ہے: یہ محل رفع میں ہے، تقدیر عبارت یہ ہے يُخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ اور ایک قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے: من ھو کاذب فسیعلم کذبہ و یذوق وبال امرہ جو جھوٹا ہے عنقریب اپنے جھوٹ کو جان لے گا اور اپنے معاملے کے وبال کا مزہ چکھ لے گا۔ فراء کا خیال یہ ہے کہ وہ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ میں هُوَ ضمیر کو اس لیے لائے ہیں کیونکہ وہ من قائم نہیں کہتے بلکہ وہ من قام، و من یقوم کہتے ہیں اور اگر من قائم کہنے کی ضرورت ہو تو من القائم کہتے ہیں، پس انہوں نے ھو کا اضافہ اس لیے کردیا تاکہ جملہ فعل یفعل کے قائم مقام ہو جائے۔ نحاس نے کہا: اس کے خلاف شاعر کا یہ شعر دلالت کرتا ہے:

مَنْ رَسُوْلِيْ اِلَى الثُّرَيَّا بِاَنِّيْ ضِقْتُ ذَرْعًا بِهَجْرِهَا وَالْكِتَابِ

وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ یعنی عذاب اور ناراضگی کا انتظار کرو، پس میں مدد اور رحمت کا منتظر ہوں۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا ایک قول یہ ہے: جبریل نے ایک چیخ ماری (2) تو ان کی روحیں ان کے جسموں سے باہر نکل آئیں۔ نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ چیخ سے مراد جبریل علیہ السلام کی چیخ ہے اور اخذت فعل مونث الصحیۃ کی وجہ سے لایا گیا ہے، جب کہ حضرت صالح علیہ السلام کے قصہ میں وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) میں فعل کی تذکیر الصیحۃ بمعنی الصیاح کی صورت میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوموں کے دو قوموں کو ایک عذاب سے ہلاک نہیں فرمایا، ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے کڑک کے ذریعے ہلاک فرمایا، صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو نیچے سے کڑک نے آلیا جبکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو اوپر سے۔ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ ابو عبدالرحمن سلمی نے كَمَا بَعُدَتْ ثَمُوْدُ عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف یہی ہے کہ جب کوئی ہلاکت ہو جائے تو بَعِدَ يَبْعَدُ بَعَدًا و بُعْدًا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 129 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 130

کہا جاتا ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے بعدت میں عین کو مضموم پڑھا تو یہ لغت خیر اور شر دونوں میں مستعمل ہے اور اس کا مصدر البعد ہے جب کہ بعدت بالخصوص شر میں استعمال ہوتا ہے۔ البعد جماعت کی قراءت کے مطابق لعنت کے معنی میں آتا ہے، بعض اوقات دو لغتوں کا معنی، معنی میں قربت کی وجہ سے جمع ہو جاتا ہے، تو یہ اس لفظ میں ہوتا ہے جس کا مصدر علی غیر لفظہ آتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

”اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور صریح غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے پیروی کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا۔ وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا روز قیامت اور لا ڈالے گا انہیں آتش (جہنم) میں۔ بہت بری داخل ہونے کی جگہ ہے جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور ان پر بھیجی جاتی رہے گی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی بہت برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا“۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس نے نبی کو حجت قائم کرنے اور ہر قسم کی علت کو ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ بِاٰیٰتِنَا یعنی تورات کے ذریعے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد معجزات ہیں۔ وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یعنی واضح حجت کے ساتھ اس سے مراد عصا ہے۔ سورۂ آل عمران میں سلطان کا معنی اور اس کا اشتقاق گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ، اَمْرَ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی شان اور حالت ہے حتی کہ انہوں نے اسے معبود بنالیا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ یعنی مضبوط حکم نہیں تھا کہ جو صحیح اور حق کی طرف لے جاتا۔ اور ایک قول کے مطابق برشید سے مراد بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے، یعنی وہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔

یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی وہ انہیں دوزخ میں لے کر جائے گا اور خود ان کا رئیس ہوگا۔ جب کوئی آگے آگے ہو تو قدمھم یقدمھم قدما و قدوما کہا جاتا ہے۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ یعنی وہ انہیں دوزخ میں داخل کرے گا۔ لفظ ماضی ذکر کیا گیا مگر معنی مضارع کا مراد ہے یعنی فیوردھم النار اور ایسا ہوتا رہتا ہے کیونکہ جس چیز کا وجود ثابت اور متحقق ہو وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہو چکی ہے، لہٰذا مستقبل کو ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ، الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ سے مراد المدخل المدخول ہے یعنی کتنی بری ہے داخل ہونے کی جگہ جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور بئست اس لیے نہیں کہا گیا کیونکہ کلام المورود کی طرف راجع تھا، اور یہ ایسے ہی ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: نعم المنزل دارک اور نعمت المنزل دارک اور المورود سے مراد وہ پانی ہے جس پر وارد ہوا جاتا ہے اور اسی طرح وہ مقام جس پر وارد ہوا جاتا ہے، یہ معنی مفعول ہے۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً یعنی دنیا میں (1) وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ولعنةً یوم القیٰمة اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ کسائی اور ابو عبیدہ نے رَفَدْتُه أَرْفِدُ رَفْدًا حکایت کیا ہے یعنی میں نے اسے عطا کیا اور عطیہ کا اسم الرفد ہے، یعنی کتنی بری عطا اور اعانت ہے۔ اور الرفد بڑے برتن کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے، تقدیر عبارت ہوگی بئس الرفد رفد المرفود ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ الرفد را کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی برتن ہوتا ہے اور الرفد را کے کسرہ کے ساتھ ہو تو برتن میں جو شراب وغیرہ ہوتی ہے وہ مراد لی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ اصمعی سے نقل کیا ہے، گویا کہ وہ جہنم میں پینے کے لیے طلب کریں گے اس کے ذریعے اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے الرفد سے مراد زیادتی ہے۔ مراد یہ ہوگی کہ غرق ہونے کے بعد دوزخ کتنا برا اضافہ ہے جس میں وہ جائیں گے، یہ کلبی کا قول ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ
ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا
جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ
الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ
عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ
اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾
فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ
سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ
عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا
یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

''یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں آپ سے ان میں سے کچھ ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں اور نہیں ظلم کیا ہم نے ان پر بلکہ انہوں نے خود زیادتی کی تھی اپنی جانوں پر۔ پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے (جھوٹے) خداؤں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی جب آ گیا حکم آپ کے رب کا۔ ان دیوتاؤں نے تو فقط ان کی بربادی میں ہی اضافہ کیا اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو درآنحالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک (اور) سخت ہوتی ہے۔ بے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 133

شک ان واقعات میں (عبرت کی) نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے عذاب آخرت سے یہ وہ دن ہے جس دن اکٹھے کیے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا اور ہم نے نہیں مؤخر کیا ہے اسے مگر ایک مقرر مدت تک جو گنی ہوئی ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو (اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے، بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے اور بعض خوش نصیب۔ سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا پروردگار بے شک آپ کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور وہ جو خوش نصیب ہیں تو وہ (نعیم) جنت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا رب۔ یہ وہ عطا ہے جو ختم نہیں ہوگی۔ تو (اے سننے والے!) نہ ہو جا تو شک میں ان کے متعلق جن کی یہ پوجا کرتے ہیں۔ وہ نہیں پوجتے مگر ایسے ہی جیسے پوجتے تھے ان کے باپ دادا اس سے پہلے۔ اور ہم یقیناً پورا پورا دینے والے ہیں انہیں ان کا حصہ جس میں ذرا کمی نہیں ہوگی''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ، ذٰلِكَ مبتدا کے مضمر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی الامر ذالك اور اگر آپ چاہیں تو اسے مبتدا ہونے کی حیثیت سے بھی مرفوع بنا سکتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا: یہ گزشتہ خبر ان بستیوں کی بعض خبروں میں سے جو ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں۔ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ حضرت قتادہ نے کہا(1): قائم سے مراد وہ ہیں جو برباد ہو چکی ہیں اور ان کے نشانات ہیں جب کے حصید سے مراد وہ ہیں جن کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے: قائم سے مراد آباد ہیں(2) جب کہ حصید سے مراد بے آباد اور برباد ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: قائم سے مراد وہ ہیں جو اپنے ساز و سامان سمیت برباد ہو چکی ہیں اور حصید سے مراد کھیتی کی طرح کٹی ہوئی ہیں۔ شاعر نے کہا:

والناس فی قسم المنیة بینهم كالزرع منه قائمٌ و حصيدٌ

لوگ اپنے اندر موت کی تقسیم میں کھیتی کی طرح ہیں اس میں سے کچھ ہے اور کچھ کٹی ہوئی ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

اِنَّما نحنُ مثلُ خَامَةِ زَرْعٍ فمتی یَاْنِ یَاْتِ مُحْتَصِدُهٗ

اخفش سعید نے کہا: حصید سے مراد محصود ہے یعنی فعیل بمعنی مفعول اور اس کی جمع حصدی اور حصاد آتی ہے جیسے مرضی اور مراض۔ اخفش ہی نے کہا: ذوی العقول کے لیے جمع حصدی آتا ہے جیسے قتیل اور قتلی۔ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ لغت میں ظلم کی اصل کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے جو اس کا مقام نہ ہو۔ سورۂ بقرہ میں یہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یعنی کفر اور گناہوں کے ذریعے۔ اور سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ ظلم ایاہ کہا جاتا ہے۔ فَمَاۤ اَغْنَتْ یعنی نہ دور کیا۔ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کلام میں حذف ہے، یعنی التی کانوا یدعون اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 134
2۔ ایضاً

یدعون کا معنی یعبدون ہے یعنی وہ عبادت کرتے تھے۔ لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ، کا معنی خسارہ اور بربادی ہے (1)، یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ لبید نے کہا:

فقد بَلِيتُ وكلُّ صاحبِ جِدّةٍ لِبِلًى يَعودُ و ذاكُمُ التَّتْبِيبُ

تَتْبِيْبٍ کا معنی ہلاکت، خسران اور بربادی ہے۔ آیت میں اضمار ہے، یعنی ما زادتهم عبادة الاصنام غير تتبيب مضاف کو حذف کر دیا گیا مراد یہ ہے کہ ان کے بتوں کی پوجا کرنے نے آخرت کے ثواب کو ضائع کر دیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى یعنی جس طرح قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیوں کو پکڑ لیا گیا اسی طرح تمام ان بستیوں کو پکڑا جائے گا جن کے باسی ظالم ہیں۔

عاصم جحدری اور طلحہ بن مصرف نے وكذالك أَخَذَ رَبُّكَ إذا اخذ القرى پڑھا ہے اور جحدری سے جماعت کی قراءت کی طرح وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى بھی مروی ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے وكذالك أَخَذَ رَبُّكَ إذا اخذ پڑھا ہے تو یہ گزشتہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کے سلسلہ میں جو عادت ہے اس کے متعلق خبر ہوگی اور معنی یہ ہوگا: اور اسی طرح تیرے رب نے ہلاک ہونے والی قوموں میں سے جس کو بھی پکڑا اسے پکڑا۔ اور جماعت کی قراءت اخذ کے مصدر ہونے کی بنیاد پر ہے اور معنی یہ ہے: اسی طرح تیرا رب جسے ہلاک کرنا چاہے اس کی پکڑ ہوتی ہے جب بھی وہ اسے پکڑ لے۔ اذ گزشتہ زمانے کے لیے آتا ہے جب کہ اذا مستقبل کے لیے آتا ہے۔ وَهِيَ ظَالِمَةٌ یعنی اس کے اہل ظالم ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا جیسے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) مراد واسأل اهل القرية ہے۔ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ یعنی مشرکین کو اس کی طرف سے ملنے والی سزا دردناک اور سخت ہے۔ صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے حتیٰ کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا'' (2)۔ پھر آپ نے كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى کی تلاوت فرمائی۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً آیت سے مراد عبرت اور نصیحت ہے۔ لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ اس کے لیے جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ ذٰلِكَ يَوْمٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَّجْمُوْعٌ يوم کی صفت ہے۔ لَّهُ النَّاسُ مجموع کا نائب فاعل ہے، اسی وجہ سے مجموعون نہیں فرمایا گیا۔ اگر آپ الناس کو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع مانیں اور مجموع لہ کو بطور خبر تو پھر مجموعون ہونا چاہیے، کیونکہ لہ فاعل کے قائم مقام ہے اور جمع سے مراد حشر ہے یعنی اس دن کے لیے جمع کیے جائیں گے۔ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ یعنی نیک اور بدکار اس کی گواہی دیتا ہے اور آسمان والے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ دونوں اسماء اور ان کے علاوہ قیامت کے دیگر اسماء کو کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں کی وضاحت کی ہے۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ یعنی اس دن کو ہم موخر نہیں کریں گے اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ یعنی اس مدت کے لیے جس کے متعلق

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 135

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138۔ صحیح مسلم، تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 320

ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ ہمارے نزدیک معدود ہے۔

یوم یاتی اس کو یَوْمَ یَاْتِ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ جب یا کا ماقبل مسکور ہو تو یا کو حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے آپ لا ادر کہتے ہیں۔ اس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ، ابو عمرو اور کسائی نے ادراج کی صورت میں یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں اسے حذف کر دیا ہے۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وقف و وصل دونوں صورتوں میں یوم یاتی یا کے اثبات کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اعمش اور حمزہ نے وقف و وصل میں بغیر یا کے یوم یات پڑھا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر وقف نہ کیا جائے اور یا کے اثبات کے ساتھ وصل کیا جائے۔ کیونکہ نحویوں کی ایک جماعت نے کہا ہے: یا کو حذف نہ کیا جائے اور بغیر جازم کے کسی چیز کو جزم نہ دی جائے، جہاں تک بغیر یا کے وقف کی بات ہے تو اس میں کسائی کا قول ہے۔ س نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل سالم پر مجزوم کی طرح وقف کیا جاتا ہے لہذا یا کو حذف کر دیا جائے گا جس طرح ضمہ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور جہاں تک حمزہ کی قراءت کا تعلق ہے تو وصل وقف میں یا کے حذف پر ابو عبید نے دو دلیلیں ذکر کی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کو بغیر یا کے دیکھا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حکایت کی ہے کہ یہ ہذیل کی لغت ہے وہ ما ادر کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: ان کی جو مصحف عثمان رضی اللہ عنہ والی دلیل ہے یہ تو ایسی دلیل ہے جس کو اکثر علماء نے رد کیا ہے۔ حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: میں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو مجھے کہا گیا کہ وہ تو چلا گیا ہے اور جہاں تک ما ادر کے ان کے قول کے ذریعے دلیل پکڑنے کی بات ہے تو اس میں کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس حذف کو تو قدیم نحویوں نے حکایت کیا ہے، اس کی علت بھی ذکر کی ہے اور اس پر اس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ فراء نے یا کے حذف پر شعر بھی پڑھا ہے:

كَفَّاكَ كَفٌّ مَا تُلِيقُ درهما جودًا وأخرى تُعْطِ بِالسَّيْفِ الدَّمَا

اس میں تعط اصل میں تعطی ہے اور سیبویہ اور خلیل نے حکایت کی کہ عرب لا ادر کہتے ہیں یا کو حذف کرتے ہیں اور کسرہ کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں مگر ان کا خیال یہ ہے کہ یہ کثرت استعمال کی وجہ سے ہے۔ زجاج نے کہا: نحو میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ یا کو ثابت رکھا جائے۔ انہوں نے کہا: جو اس کو مصحف کا اتباع اور قراء کا اجماع خیال کرتا ہے، (تو اس اعتبار سے بھی) کیونکہ قراءت سنت ہے اور اس طرح بھی کلام عرب میں وارد ہوا ہے۔ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اصل تتکلم ہے تخفیفاً ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کلام میں اضمار ہے، یعنی لا تتکلم فیہ نفس الا بالما ذون فیہ من حسن الکلام اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی دلیل کے بارے میں گفتگو کر سکے گا اور نہ ہی شفاعت کے متعلق۔

ایک قول یہ ہے کہ حشر میں اس کی اجازت کے بغیر ان کے لیے ایک ایسا وقت ہو گا جس میں اس کی اجازت کے بغیر ان پر کلام کرنے کی ممانعت ہو گی۔ اور یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں دین میں ملحد اکثر سوال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۙ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات) کیوں کہا گیا ہے حالانکہ قیامت کے ذکر میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) کہ وہ

ایک دوسرے کی طرف ملامت کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (النحل: 111) جس دن ہر نفس اپنے بارے میں جھگڑتے ہوئے آرہا ہوگا۔ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (الصافات) اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی۔

فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ (الرحمن) تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ وہ ایسی حجت کے بارے میں نہیں بولیں گے جو انہیں لازم ہوگی بلکہ صرف اپنے گناہوں کے اقرار، ایک دوسرے کو ملامت کرنے، اور ایک دوسرے پر گناہ کا الزام ڈالنے کے حوالے سے گفتگو کریں گے البتہ انہیں حجت اور دلیل کے متعلق گفتگو اور کلام کی اجازت نہیں ہوگی۔

اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے ایک آدمی اکثر آپ کو مخاطب کرتا ہو اور اس کا خطاب حجت و دلیل سے خالی ہو تو اسے آپ کہتے ہیں: تو نے کوئی کلام کیا ہی نہیں، تو بولا ہی نہیں۔ لہٰذا جو آدمی بغیر حجت و دلیل کے بولا اسے کہا گیا کہ وہ بولا ہی نہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: وہ دن بہت لمبا ہوگا اور اس میں ٹھہرنے کے لیے کئی مقامات ہوں گے، جن میں سے بعض میں گفتگو کی ممانعت ہوگی اور بعض مقامات میں اجازت ہوگی۔ پس یہ صورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوئی نفس اس کی اجازت کے بغیر کلام نہیں کرے گا۔ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ یعنی نفوس میں سے یا لوگوں میں سے کچھ بدنصیب ہیں اور کچھ سعادت مند۔ الله تعالیٰ نے انہیں کو اپنے ارشاد یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ میں ذکر فرمایا ہے۔ شقی وہ ہے جس پر بدنصیبی لکھ دی گئی ہو اور سعید وہ ہے جس پر سعادت لکھ دی گئی ہو۔ لبید نے کہا:

فمنهم سعيدٌ آخذ بنصيبه ومنهم شقيٌّ بالمعيشةِ قانع

ان میں سے کوئی سعادت مند ہے جو اپنا حصہ وصول کر رہا ہے اور کوئی بدنصیب ہے زندگی پر قناعت کرنے والا ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: جب یہ آیت فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ نازل ہوئی تو میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میں نے عرض کی: اے الله کے نبی! ہم کس چیز کے مطابق عمل کرتے ہیں؟ کیا اس کے مطابق جن کاموں سے فراغت ہو گئی ہے یا جن سے فراغت نہیں ہوئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلکہ جس چیز سے فراغت ہو گئی ہے (1)، اے عمر اس کے مطابق قلم لکھ چکے ہیں لیکن جس کے لیے بندے کو پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے"۔ هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه۔ ہم اس کو صرف حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہی جانتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا یہ مبتدا ہے۔ فَفِی النَّارِ یہ محل خبر میں ہے اور اسی طرح لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ابو العالیہ نے کہا: زفیر سینے سے (نکلی ہوئی آواز) ہے (2) اور شھیق حلق سے (نکلی ہوئی آواز) ہے۔ انہیں سے اس کے برعکس بھی مروی ہے۔ زجاج نے کہا: زفیر رونے کی شدت میں سے ہے اور شھیق بہت زیادہ بلند آواز سے رونے کی آواز ہے۔ زجاج نے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138، حدیث نمبر 3036، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139

نے کہا ہے: کوفی اور بصری اہل لغت کا خیال یہ ہے کہ زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز ہے اور شھیق اس کی آخری آواز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے برعکس ارشاد فرمایا ہے: آپ نے فرمایا زفیر سخت آواز جب کہ شھیق کمزور آواز ہے(1)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا: زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز کی طرح ہے اور شھیق اس کی آخری آواز ہے جب وہ ہینگنا ختم کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

حَشْرَجَ فِی الجوفِ سَحِیلًا أو شَہَقْ حتی یُقالَ ناہِقٌ وما نَہَقْ

سحیل اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھے کے سینے میں گھومتی ہے اور شہق حلق سے نکلی ہوئی آواز ہے۔

ایک قول یہ ہے: زفیر سانس کا نکلنا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیٹ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو سانس کے ذریعے وہ نکلتا ہے اور شہیق اس کا واپس لوٹانا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زفیر شدت غم سے سانس کو لوٹانا ہے یہ زفر سے ماخوذ ہے اور یہ پیٹھ پر بوجھ ہے اور شہیق لمبا کھینچا ہوا سانس ہے۔ یہ عربوں کے قول جبل شاھق سے ماخوذ ہے، یعنی لمبا اور بلند پہاڑ اور زفیر اور شہیق دونوں پریشان لوگوں کی آوازوں میں سے ہیں(2)۔

قولہ تعالیٰ: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ، مَا دَامَتِ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مراد دوام السموات والارض ہے اور تقدیر وقت ذالک ہے یعنی اس کا وقت آسمانوں اور زمین کا دوام ہے۔ اس کی تاویل میں اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا جس میں ضحاک بھی ہیں: معنی یہ ہے کہ جب تک جنت و دوزخ کے آسمان اور ان کی زمینیں ہیں۔ السماء ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تیرے اوپر ہے اور تیرے اوپر سایہ کیے ہوئے ہیں اور الْاَرْض جس پر تیرے قدم قرار حاصل کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے: وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (زمر:74) اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: ان سے مراد دنیا کے آسمان و زمین ہی ہیں اور عربوں کی عادت کے مطابق کسی چیز کے دوام اور ابدیت کے متعلق خبر دی جا رہی ہے۔ جس طرح ان کا قول: میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا جب تک رات ہے، یا پانی بہہ رہا ہے، جب تک رات اور دن کا اختلاف ہے، جب تک کبوتری کی آواز ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں، اور اس جیسے دیگر جملے جن سے وہ لامتناہی اور لمبا وقت مراد لیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آسمانوں اور زمین کے زوال کے ذریعے خبر دی مگر کفار کے ہمیشہ اس میں رہنے کی خبر دے دی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیدا ہونے والی تمام چیزوں کی اصل عرش کے نور سے ہے(3)، اور آخرت میں آسمان اور زمین اسی نور کی طرف واپس لوٹ جائیں گے جس نور سے انہیں لیا گیا تھا، لہٰذا یہ دونوں عرش کے نور میں ہمیشہ دائمی ہیں۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ استثنا منقطع ہے، اس کے بارے میں دس اختلافی اقوال ہیں۔ پہلا قول

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 208

یہ ہے کہ یہ فَفِي النَّارِ سے استثنا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سوائے اس کے کہ تیرا پروردگار کسی قوم سے اس کو مؤخر کرنا چاہے۔ اس قول کو ابونضرہ نے حضرت ابوسعید خدری یا حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے من شاء نہیں فرمایا کیونکہ مراد تعداد ہے اشخاص نہیں، جس طرح نکاح کے باب میں ما طاب لکم فرمایا جتنی تمہیں پسند آئیں۔ ابونضرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے۔ ''مگر جن کو چاہے اللہ تعالیٰ داخل نہ کرے اگرچہ وہ نافرمانی کی وجہ سے بدنصیب ہی کیوں نہ ہوں''۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ استثنا نافرمان مومنین کے لیے ہے کہ انہیں دوزخ میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نکال لیا جائے گا۔ اس اعتبار سے فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا کفار اور نافرمان مومنوں کے لیے عام حکم ہوگا اور خالدین سے ہی استثناء ہوگی۔ یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور ابوسنان وغیرہ کا قول ہے۔ صحیح میں حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے حتی کہ جب وہ راکھ اور کوئلہ ہو جائیں گے تو انہیں اس سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ جہنمی ہیں''۔ سورۃ النساء میں یہ گزر چکا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ استثنا زفیر اور شہیق سے ہے، یعنی ''لهم فيها زفير و شهيق الا ما شاء ربك'' ان کے لیے زفیر اور شہیق ہے مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا ان کے لیے عذاب کی وہ اقسام ہوں گی جن کو اللہ نے ذکر نہیں کیا، اسی طرح اہل جنت کے لیے وہ نعمتیں ہوں گی جن کا اس نے ذکر کیا اور جن کا ذکر نہیں کیا۔ اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے۔

چوتھا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اس میں نہ وہ مریں گے (2)، اور نہ ہی انہیں اس سے نکالا جائے گا۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اور وہ یہ ہے کہ وہ آگ کو حکم دے گا تو وہ انہیں کھا جائے گی اور فنا کر دے گی، پھر اللہ تعالیٰ دوبارہ نئے سرے سے ان کی تخلیق فرمائے گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول کافر کے ساتھ خاص ہے اور اس کے لیے کھانے اور نئی تخلیق میں استثنا ہے۔

پانچواں: الا بمعنی سوی ہے جس طرح آپ کلام میں کہتے ہیں: ما معی رجل إلا زيد اور لى عليك الفا درهم الا الالف التى لى عليك میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں سوائے زید کے اور میرا تیرے اوپر دو ہزار درہم ہے سوائے اس ایک ہزار کے جو میرا تیرے اوپر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تک آسمان اور زمین ہیں سوائے اس کے کہ جتنا تیرا رب خلود میں سے چاہے گا۔

چھٹا: یہ اخراج سے استثنا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ انہیں جہنم سے نکالے، جس طرح آپ گفتگو میں کہتے ہیں: أردتُ أن أفعل ذالك إلا إن شاء غيره اور حال یہ ہے کہ آپ اس فعل پر قائم ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر اس نے انہیں نکالنا چاہا تو وہ انہیں نکال لے گا لیکن اس نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ دو قول زجاج نے اہل لغت سے نقل کر کے ذکر کیے ہیں، اور کہا کہ اہل معانی کے دو اور قول بھی ہیں: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی ان کی قبروں کے سرہانے پر ان کے موقف کی مقدار میں سے اور محاسبہ کے لیے، اور دنیا اور برزخ میں ان کے ٹھہرنے کی مقدار اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 505 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 142

حساب کے لیے وقوف کی مقدار میں سے جتنا تیرا پروردگار چاہے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ استثنا کا وقوع نعمت اور عذاب پر زیادتی میں ہے تقدیر یہ ہوگی: وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا اہل جنت کے لیے نعمتوں کی زیادتی اور اہل دوزخ کے لیے عذاب کی زیادتی میں سے۔

میں (قرطبی) نے کہا: دنیا میں آسمان اور زمین کے ہونے کی مدت کی مقدار خلود سے زیادتی میں یہ استثنا ہے اور اس کو ترمذی حکیم ابو عبداللہ محمد بن علی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار وہ جہنم میں رہیں گے، اور یہ دنیا کی موت ہے جب کہ آسمان اور زمین کے لیے ایسا وقت بھی ہے جس میں یہ تبدیل ہو جائیں گے، اللہ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ (ابراہیم: 48) اس دن زمین دوسری زمین سے تبدیل کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی اور ان کے عامل پیدا کیے، ان میں سے کچھ کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خریدا، اور اس پر میثاق والے دن ان سے عہد لیا، جس نے عہد پورا کیا اس کے لیے جنت ہے، اور جو اپنی جان لے کر چلا گیا وہ دوزخ میں آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار رہے گا، یہ دونوں معاملہ کے لیے رہیں گے، اسی طرح اہل جنت کا جنت میں خلود اس کی مقدار کے مطابق ہوگا، جب یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا تو سارے کے سارے اللہ کی مشیت میں آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (الانبیاء) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (الدخان: 39)

پس جنت و دوزخ دونوں کے باسی آسمان و زمین کے دوام کی مقدار رہیں گے، اس مقدار کے ساتھ یہ حق ربوبیت ہے، پھر ان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ یہی دونوں دار لازم فرما دے گا اور یہ حق احدیت کی وجہ سے ہے، پس جو اس کی احدیت کی وجہ سے موحد ہو کر اسے ملا تو وہ ہمیشہ اپنے دار میں باقی رہے گا، اور جو اس کی احدیت کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک ٹھہراتے ہوئے اسے ملا وہ ہمیشہ قید میں باقی رہے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خلود کی مقدار کے بارے میں بتا دیا، تو فرمایا: اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی مدت کی اس زیادتی کے بارے میں جو اللہ چاہے گا جس زیادتی کا ادراک انسانی قلوب و اذہان کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ اس کی کوئی انتہا اور غایت نہیں۔ اعتقادی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے دارین میں ان کا خلود دائمی ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الا بمعنی واؤ ہے۔ یہ فراء اور بعض اہل نظر کا قول ہے اور یہی آٹھواں قول ہے۔ معنی یہ ہوگا (1): دنیا میں آسمان و زمین کے دوام کی مدت پر خلود میں اضافے اور زیادتی میں سے جتنا تیرا رب چاہے گا۔ قرآن مجید میں الا بمعنی واؤ استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (الطور: 47) یعنی والذین ظلموا اور شاعر نے کہا:

وكلُّ أخٍ مفارقُه أخوه لعَمْرُ أبيكَ إلّا الفرقدان (2)

یہاں بھی الا الفرقدان بمعنی و الفرقدان ہے۔ ابو محمد مکی نے کہا: بصریوں کے نزدیک یہ بڑے دور کی بات ہے کہ الا بمعنی واؤ ہو۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے اس کا معنی ہے کما شاء ربك یعنی جس طرح تیرا رب چاہے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 22) یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 143
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507

کما قد سلف یہ نواں قول ہے۔

دسواں: دسواں قول یہ ہے کہ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ میں استثنا کا استعمال صرف ایسے ہی ہے جیسا کہ ہر کلام میں اس کا استعمال مستحب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح: 27) اب یہ واجب میں استثناء ہے، اور یہ استثناء اسی طرح شرط کے حکم میں بھی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان شاء ربك اور اس کی صفت نہ متصل سے اور نہ ہی منقطع سے بیان کی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ اس کی تائید کرتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے اور اس قسم کی دلیل ابو عبید سے بھی منقول ہے اس نے کہا: اس سے پہلے دارین میں فریقین کے خلود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کی عزیمت گزر چکی ہے، فوراً بعد استثنا کا لفظ وارد ہو گیا ہے، جب کہ عزیمت خلود میں گزر چکی ہے۔ ابو عبید نے پھر کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح: 27) کی طرح ہے کہ یہ بات معلوم ہے کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر داخل ہوں گے۔ لہٰذا ان دونوں مقامات پر استثنا خیار کو ثابت نہیں کرتی، کیونکہ دارین میں خلود کے بارے میں اور مسجد حرام میں دونوں کے بارے میں مشیت عزیمت کے ساتھ گزر چکی ہے، فراء سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ اور گیارہواں قول یہ ہے کہ اشقیاء ہی سعداء ہیں اور سعداء ہی اشقیاء ہیں ان کے علاوہ نہیں، دو مقامات پر استثنا انہیں کی طرف راجع ہے، اور اس کی وضاحت اور بیان یہ ہے کہ ما بمعنی من ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں میں سے استثناء ان لوگوں کی کی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے اپنے ایمان کی وجہ سے ان جہنمیوں میں سے نکل جائیں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہوں گے پھر دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے پس یہی لوگ ہیں جن پر دوسری استثنا واقع ہوئی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جس کو آپ کا پروردگار چاہے گا تو اسے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رکھے گا، یعنی فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ (ہود: 107) الا یخلدہ فیہا اور یہ وہ لوگ ہیں جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اپنے ایمان اور محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکلیں گے۔ لہٰذا جہنم میں ان کے داخل ہونے کی وجہ سے انہیں شقی اور بدنصیب کہا گیا اور جنت میں ان کے داخلہ کی وجہ سے سعید اور خوش نصیب کہلائے، جس طرح ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: جو لوگ خوش بخت اور سعادت مند ہیں وہ دوزخ میں داخل ہونے کی وجہ سے بدنصیب اور شقی ہو گئے پھر دوزخ سے نکلنے اور جنت میں داخل ہونے کی وجہ سے سعادت مند ہو گئے۔

اعمش، حفص، حمزہ اور کسائی نے وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اس کے سعدوا ہونے پر دلیل یہ ہے کہ پہلا اشقوا ہے اشقوا نہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ وہ کسائی کی قراءت سعدوا پر تعجب کا اظہار کرتے حالانکہ کسائی عربی کو جانتے تھے، اگر یہ بولنے کی طرز تھی تو درست نہیں، کیونکہ سعد فلان وأسعدہ اللہ، وأسعد بروزن امرض کہا جاتا ہے، کسائی نے ان کے قول مسعود سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس میں ان کے لیے کوئی

حجت نہیں، کیونکہ مکان مسعود فیہ کہا جاتا ہے پھر اس میں سے فیہ کو حذف کر دیا جاتا اور مسعود نام بن گیا۔ مہدوی نے کہا: جس نے سعدوا کی سین کو ضمہ دیا تو اس صورت میں یہ عربوں کے قول مسعود پر محمول ہوگا، اور یہ شاذ اور قلیل ہے، کیونکہ سعدہ اللہ نہیں کہا جاتا بلکہ صرف ''أسعدہ اللہ'' کہا جاتا ہے۔ ثعلبی نے کہا: سعدوا سین کے ضمہ کے ساتھ کا مطلب ہے رزقوا السعادۃ کہ انہیں سعادت عطا فرمائی گئی۔ سعد اور اسعد ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں نے سعدوا کو شقوا پر قیاس کرتے ہوئے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبید اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

جوہری نے کہا: سعادت، شقاوت کے خلاف ہے۔ آپ سعد الرجل فھو سعید کہتے ہیں جیسے سلم اور سلیم ہے اور سعد فھو مسعود اس میں مسعد نہیں کیا جاتا، گویا وہ مسعود کے ذریعے اس سے مستغنی ہوگئے۔

ابونصر عبدالرحیم قشیری نے کہا: سعدہ اللہ فھو مسعود اور أسعدہ اللہ فھو مسعد بھی وارد ہوا ہے، یہ کوفیوں کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جس طرح شقی فلان نہیں کہا جاتا اسی طرح سعد فلان بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ متعدی نہیں۔ ''عطاء غیر مجذوذ، غیر مجذوذ'' سے مراد غیر مقطوع ہے (1) یعنی نہ ختم ہونے والی عطا، یہ جَذَّ یَجُذُّ سے ہے جس کا معنی ہے اس نے کاٹا، نابغہ نے کہا:

تَجُذُّ السَّلُوقِیَّ المضاعفَ نَسْجُهُ وتُوقِدُ بالصُّفَّاحِ نارَ الحُبَاحِبِ

تَجُذُّ کا معنی ہے وہ کاٹتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تَكُ نہی کی وجہ سے مجزوم ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے۔ فِیْ مِرْیَةٍ یعنی شک میں۔ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ یعنی اے سننے والے! جن معبودوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان کے باطل ہونے میں تو شک میں مبتلا نہ ہو جا۔ اور اس سے بھی خوبصورت اور عمدہ بات یہ ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس آدمی کو فرما دیجئے جو شک میں ہے: فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات کا حکم نہیں دیا۔ پس یہ ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباء و اجداد نے ان کی عبادت کی تو یہ ان کی تقلید کرتے ہیں۔ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ان کے بارے میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ رزق میں ان کا حصہ مراد ہے (2)۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عذاب میں ان کا حصہ مراد ہے (3)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ خیر اور شر میں سے جن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ مراد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب پھر اختلاف کیا جائے گا اس میں اور اگر ایک بات پہلے طے نہ کر

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 145 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507 3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 146

دی گئی ہوتی آپ کے پروردگار کی جانب سے تو فیصلہ کر دیا گیا ہوتا ان کے درمیان اور بے شک وہ ایسے شبہ میں ہیں اس کے متعلق جو بے چین کر دینے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ قیامت تک ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا جائے کیونکہ اسی میں صلاح اور بہتری معلوم ہوتی ہے، اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان ان کی اجل کا فیصلہ ہو جاتا کہ مومن کو ثواب دیا جائے اور کافر کو سزا، ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ مراد ہے یا اس صورت میں وہ مصدق اور مکذب کے درمیان تھے۔ ایک قول یہ ہے: اے محمد! ﷺ آپ کی ذات کے بارے میں ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان اگر عقاب میں جلدی کے بارے میں فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو عذاب نازل کر دیا جاتا لیکن اس امت سے قیامت تک عقاب کی تاخیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر حکم لگاتے ہیں یعنی یہ کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں شک میں تھے تو یہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾

"اور یقیناً ان سب (اختلاف کرنے والوں) کو پورا پورا بدلہ دے گا انہیں آپ کا رب ان کے کرتوتوں کا، بے شک اللہ تعالیٰ جو کام وہ کرتے ہیں ان سے خوب آگاہ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ یعنی وہ تمام قومیں جنہیں ہم نے شمار کیا ہے اپنے اعمال کی جزاء کو دیکھ لیں گی۔

اے محمد! ﷺ اسی طرح آپ کی قوم بھی دیکھ لے گی۔ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل حرمین؛ نافع، ابن کثیر اور ان کے ساتھ ابو بکر نے وان کلا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے ان مثقلہ سے مخففہ مُعْمله بنایا ہے۔ خلیل نحوی اور سیبویہ نے بھی اسے ذکر کیا ہے، سیبویہ نے کہا: ہمیں ایک ایسے آدمی نے بیان کیا ہے جس پر میں اعتماد کرتا ہوں کہ اس نے عربوں کو اِن زیدًا لَمنطلقٌ کہتے سنا ہے۔ اور شاعر کا شعر بھی بطور استدلال اس نے پڑھا:

كَاَنْ ظَبْيَةٌ تَعْطُوْا اِلٰى وَارِقِ السَّلَمْ

اس کی مراد کانها ظبیة ہے یعنی اس کو مخفف کر دیا اور مابعد کو نصب دے دی، بصری اَن مشددہ کو عاملہ بناتے ہوئے بھی اس کی تخفیف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جب کہ کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا: میں نہیں جانتا کہ کس بنیاد پر وان کلا پڑھا گیا ہے اور فراء کا خیال یہ ہے کہ جس نے تخفیف کی ہے اس نے کلا کو لَیُوَفِّیَنَّهُمْ کی وجہ سے نصب دی ہے وان لیوفینهم کلا جب کہ تمام نحویوں نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: یہ بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے۔ کسی کے نزدیک بھی زیدا لاضربنه جائز اور صحیح نہیں ہے اور باقیوں نے ان کو مشدد پڑھا اور کلا کو اس کی اصل کے مطابق اس کے ذریعے نصب دی ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور ابن عامر نے لما کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ان کلا لیوفینهم کے معنی پر اسے مخفف پڑھا ہے،

اور ماکوانہوں نے صلہ بنایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ ان دو لاموں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لیے آیا ہے جو قسم پر آتی ہیں، اور وہ دونوں مفتوح ہیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا۔ زجاج نے کہا: لما کی لام تو ان کی وجہ سے ہے جب کہ ما زائدہ مؤکدہ ہے، جیسے آپ ان زیدا لمنطلق کہتے ہیں۔ ان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اسم یا خبر پر لام داخل ہو جیسے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ) اور اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى (ق:37) اور لَيُوَفِّيَنَّهُمْ میں موجود لام وہ ہے جس کے ذریعے قسم کے ساتھ ملا جاتا ہے، یہ فعل پر داخل ہوتی ہے اور اسے نون مشددہ یا مخففہ لازم کر دیتی ہے اور جب دو لامیں جمع ہو گئیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا اور ما زائدہ مؤکدہ ہے۔ فراء نے کہا: ما بمعنی من ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (النساء:72) میں ہے یعنی وَاِنَّ كُلًّا لَّمَا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ اور لَيُوَفِّيَنَّهُمْ میں لام قسم کے لیے ہے۔ اس کا معنی زجاج کے قول کے مطابق ہے البتہ یہ فرق ہے کہ زجاج کے نزدیک ما زائدہ ہے جب کہ فراء کے نزدیک ما بمعنی من اسم ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ زائدہ نہیں، بلکہ یہ اسم ہے اور اس پر لام تاکید داخل ہوئی اور یہ ان کی خبر ہے جب کہ لَيُوَفِّيَنَّهُمْ جواب قسم ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: وان کلا خلق لیوفینهم ربك أعمالهم یقیناً سب کے سب مخلوق ہیں تیرا رب ضرور انہیں ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی من ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء:3) میں ما بمعنی من ہے۔ اور یہ سارے کا سارا بعینہ فراء کا قول ہے۔ اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے لما اور ان دونوں کو مشدد یعنی وان کلا لمّا پڑھا ہے۔ اور وہ حمزہ اور اس کی موافقت کرنے والے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ ایک لہجہ ہے، جو محمد بن زید سے منقول ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ ان زیدا الا لاضربنه نہیں کہا جاتا اور نہ ہی ان زیدا لمّا لضربته کہا جاتا ہے اور کسائی نے کہا: اس قراءت کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کسائی اور ابو علی فارسی نے یہ بھی کہا ہے: ان دونوں کو مشدد پڑھنا مشکل ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا: نحویوں کے اس بارے میں کئی اقوال ہیں۔

پہلا: اس کی اصل لمن ما ہے نون کو میم سے بدلا، تین میمیں جمع ہو گئیں تو درمیان والی کو حذف کر دیا گیا تو لما بن گیا اس قول کے مطابق ما بمعنی مَن ہے اور اس کی تقدیر وان کلا لمن الذین ہے، جس طرح کہ ان کا یہ قول:

وانّی لمّا أُصدِرُ الأمرَ وجهَهُ إذا هو أعيا بالسبيلِ مَصادِرُه

اس شعر میں لما کی یہی صورتحال ہے۔

زجاج نے اس قول کو ناکارہ قرار دیا ہے اور کہا: من دو حرفوں پر مشتمل ایک اسم ہے لہٰذا اس کا حذف جائز نہیں۔

دوسرا: اصل لمن ہے اجتماع میمات کی وجہ سے میم مکسورہ کو حذف کر دیا گیا، تقدیر عبارت وَاِنَّ كُلًّا لَّمَا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: لما، لم کا مصدر ہے اور وصل کو وقف پر محمول کرتے ہوئے بغیر تنوین کے آیا ہے، اس بنیاد پر یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر) کی طرح ہے اکلا لما سے مراد مال ماکول کو جامع ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت: وان کلا لیوفینهم ربك أعمالهم توفية لمّا ہو گی۔ اور معنی ہو گا: ان سب کے اعمال کو جامع، اور یہ آپ کے قول:

قیاماً لکم من کی طرح ہے۔ اور زہری نے اس معنی کی بنیاد پر لماً تشدید اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔

تیسرا: لمّا، اِلّا کے معنی میں ہے اہل لغت نے حکایت کیا ہے: سالتك بالله لما فعلت یعنی اِلّا فعلت اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ (الطارق) اسی کی طرح ہے یعنی الا علیہا حافظ تو آیت کا معنی یہ ہوگا: ان میں سے کوئی بھی نہیں مگر وہ انہیں ضرور پورا پورا بدلہ دے گا۔ ماکل واحد منهم الا لیوفینهم۔ قشیری نے کہا: زجاج نے اس قول کو اس بنیاد پر ناکارہ قرار دیا ہے کہ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا میں نفی ہے ہی نہیں کہ اِلّا کو مقدر مان لیا جائے اس پر دلیل یہ ہے کہ ذهب الناس لما زید تو نہیں کہا جاتا (یعنی بغیر نفی کے الا نہیں آتا)۔

چوتھا: ابوعثمان مازنی نے کہا: اصل میں وَاِنَّ كُلًّا لَمَا، لَمَا کی تخفیف کے ساتھ ہے پھر اس پر شد ڈال دی گئی، جس طرح کہ یہ شعر ہے:

لقد خشیتُ أنْ أری جدبًّا　　فی عامِنا ذا بعدَ ما أخصبًّا

اس میں جدبا، لقد اخصبا اصلاً بغیر شد کے ہیں بعد میں ان کو مشدد کر دیا گیا ہے۔

ابواسحاق زجاج نے کہا: یہ غلط ہے: مثقل کو تو مخفف بنایا جاتا ہے مگر مخفف کو مثقل نہیں بنایا جاتا۔

پانچواں: ابوعبید قاسم بن سلام نے کہا: ہوسکتا ہے کہ تشدید عربوں کے اس قول کے قبیل سے ہو: لَمَمْتُ الشیء اَلُمُّهٗ لَمًّا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ اس چیز کو جمع کرلیں، پھر اس سے فعلی کا وزن بنالیا گیا ہو جس طرح ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون: 44) پڑھا جاتا ہے، یہ تنوین اور بغیر تنوین دونوں طرح آتا ہے، اس بنیاد پر الف تانیث کا ہوگا، اصحاب امالہ کے نزدیک اس قول پر امالہ کیا جائے گا۔

ابواسحاق نے کہا: وہ بات کہ جس کے علاوہ میرے نزدیک کوئی اور جائز ہی نہیں وہ یہ ہے کہ یہ مخففہ من مثقلہ ہو اور ما کے معنی میں ہو جس طرح اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ (الطارق) ہے اور اسی طرح اپنی اصل کے مطابق یہ مشدد بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں بھی یہ بمعنی ما ہوگا اور لما بمعنی الا ہوگا۔ یہ خلیل، سیبویہ اور تمام مصریوں سے منقول ہے۔ اور لما بمعنی الا استعمال ہوتا رہتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول جس کو زجاج نے پسند کیا ہے اسے زجاج سے نحاس وغیرہ نے بیان کیا ہے، اسی جیسا قول اور زجاج کا اسے ضعیف قرار دینا گزر چکا ہے البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس قول میں ان نافیہ ہے اور وہاں مخففہ من مثقلہ ہے پس دونوں میں فرق ہے۔ اب دو قراءتیں باقی رہ گئیں۔ ابوحاتم نے کہا: ابی کے حرف میں وان کل الا لیوفینهم ہے اور اعمش سے وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا مروی ہے یعنی ان کی تخفیف کل کے رفع اور لما کی تشدید کے ساتھ۔ نحاس نے کہا: یہ قراءتیں جماعت کے مخالف ہیں اس میں ان بمعنی ما ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی، کیونکہ جماعت کے مخالف سوائے اس طریقے کے پڑھنا جائز نہیں۔ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۱۱۲

''پس آپ ثابت قدم رہیے جیسے حکم دیا گیا ہے آپ کو اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں اور سرکشی نہ کرو بے شک جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے خوب دیکھ رہا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر لوگوں کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: استقم یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دین پر قائم رہنے کی گزارش کرتا ہوں اور اس سے اس بات کا سوال کرتا ہوں لہٰذا استقم کی سین سوال کی سین ہوگی۔ جس طرح آپ استغفر اللہ کہتے ہیں یعنی میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ دائیں، بائیں کی طرف سے کوئی چیز لیے بغیر صرف ایک ہی جہت میں استمرار اختیار کرنا استقامت کہلاتا ہے، یعنی اللہ کے امر کی بجا آوری پر ثابت قدم رہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیے جس کے متعلق میں آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں؟ آپ نے فرمایا: قل أمنتُ باللہ ثم استقم کہہ دو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم ہو جا (1)۔

ابو محمد دارمی نے عثمان بن حاضر ازدی سے اپنی مسند میں روایت بیان کی ہے اس نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو میں نے کہا: مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ کا تقویٰ اور استقامت کو لازم پکڑ، اتباع کر اور بدعت اختیار نہ کر۔ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ یعنی آپ بھی ثابت قدم رہیں اور جو آپ کے ساتھ تائب ہو کر آئے ہیں ان سے مراد آپ کے وہ صحابہ ہیں جنہوں نے شرک سے توبہ کی اور ان کے بعد آپ کی امت میں سے جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی بھی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جو آپ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شدید ہو، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے جب آپ کو عرض کی کہ آپ پر بڑی تیزی سے بڑھاپا آ گیا ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: ''مجھے (سورت) ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ سورت کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے۔

ابو عبدالرحمن سلمی سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے ابو علی سری کو کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے ہود نے بوڑھا کر دیا''۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ میں نے آپ کو عرض کیا: اس میں سے کس چیز نے آپ کو بوڑھا کیا؟ انبیاء کے قصص نے یا امتوں کی ہلاکت نے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، اللہ کے ارشاد فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے''۔ وَلَا تَطْغَوْا سرکشی سے نہی ہے۔ طغیان، حد کو تجاوز کرنا ہے، اسی سے اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) ہے جب پانی نے حد سے تجاوز کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی پر بھی جبر نہ کرو۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 48

''اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ، اور (اس وقت) نہیں ہو گا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَرْكَنُوْٓا، رکون کی حقیقت کسی چیز سے سکون حاصل کرنا، اس پر اعتماد کرنا، اس کی طرف جھکنا اور اس پر راضی ہونا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت نہ کرو اور ان کی اطاعت نہ کرو (1)۔ ابن جریج نے کہا: ان کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرو۔ ابو العالیہ نے کہا: ان کے اعمال کو پسند نہ کرو (2)۔ یہ تمام کے تمام قریب قریب ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہاں رکون سے مراد مداہنت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کو وہ ناپسند نہ کرے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور نے تَرْكَنُوْٓا کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو نے کہا: یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ طلحہ بن مصرف، قتادہ اور دیگر لوگوں نے تَرْكُنُوْٓا کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، فراء نے کہا: یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔ اور بعض لوگوں نے رَكِنَ يَرْكَنُ بروزن مَنَعَ يَمْنَعُ کو بھی جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں جب کہ ایک قول کے مطابق اس سے مراد عام کافر اور نافرمان لوگ ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا الآیۃ (الانعام: 68) ہے۔ اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو ہماری آیتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کے معنی میں یہی صحیح ہے اور یہ کفار اور بدعتیوں میں سے نافرمان لوگوں کو چھوڑنے پر دلالت کرتی ہے۔ یقیناً ان کی صحبت کفر یا معصیت ہے، کیونکہ صحبت صرف محبت ہی سے ہوتی ہے، ایک حکیم نے کہا ہے:

عن المرء لا تسأل وسَلْ عن قرينه فكلُّ قرينٍ بالمقارن يقتدِي

آدمی کے بارے میں نہ پوچھ، ان کے دوست کے بارے میں پوچھ، ہر دوست اپنے دوست کی اقتدا کرتا ہے۔

اور اگر صحبت صرف ضرورت یا تقیہ کی بنیاد پر ہو تو اس کے بارے میں سورۂ آل عمران اور المائدہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اور مجبوری کی حالت میں تقیہ پر ظالم کی صحبت نہی سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی ان کے ساتھ ملنے، صحبت اختیار کرنے، ان کے اعراض کے باوجود ان کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے اور ان کے معاملات میں ان کی موافقت کرنے کی وجہ سے آگ تمہیں بھی جلائے گی۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ﴿۱۱۴﴾

''اور قائم کیجئے نماز دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات کے حصوں میں، بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو، یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1066 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 508

اس میں چھ مسائل ہیں:۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ اہل تاویل میں سے کسی نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ اس آیت میں نماز سے مراد فرض نمازیں ہیں۔ اور ان کو بالخصوص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان کی ثانی ہیں اور مشکلات میں انہیں کی پناہ تلاش کی جاتی ہے، نبی کریم ﷺ جب بھی کوئی مصیبت و پریشانی آتی تو آپ نماز کی پناہ لیتے تھے۔ صوفیاء کے شیوخ نے کہا ہے: اس آیت سے فرض اور نفل عبادت میں اپنے سارے اوقات کو صرف کرنا مراد ہے (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے، یقیناً امر اس بات کو شامل نہیں حتیٰ کہ نہ واجب کو اور نہ ہی نفل کو شامل ہے۔ اوراد معلوم ہیں اور وہ اوقات جن میں نوافل کی ترغیب دی گئی ہے وہ محدود ہیں، ان کے علاوہ جتنے اوقات ہیں وہ مستحب اوقات ہیں بدل کی بنا پر نہ کہ عمومیت کی بنا پر اور یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: طَرَفَيِ النَّهَارِ مجاہد نے کہا: پہلی طرف صبح کی نماز ہے (2)، اور دوسری طرف ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ اس کو ابن عطیہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ دو طرفیں صبح اور مغرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت حسن ہی سے مروی ہے: دوسری طرف صرف عصر ہے اور حضرت قتادہ و ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: دو طرفیں ظہر اور عصر ہیں۔ اور زلف سے مغرب، عشاء اور صبح مراد ہے۔ گویا اس کہنے والے نے قراءت کے جبر کی رعایت کی ہے۔ ماوردی نے بیان کیا ہے کہ طرف اوّل بالاتفاق صبح کی نماز ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس اتفاق کو اس سے پہلے والا قول توڑ دیتا ہے اور طبری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دو طرفوں سے مراد صبح اور مغرب ہے اور یہ ظاہر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مغرب اس میں داخل نہیں کیونکہ یہ رات کی نماز ہے۔ ابن عربی نے کہا: طبری سے تعجب ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کو دو طرفیں خیال کر لیا ہے حالانکہ یہ دونوں رات کی طرفیں ہیں۔

نقلب القوس د کوۃ دحادعن البرجاس غلوۃ

طبری نے کہا: اس پر دلیل تمام لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو طرفوں میں سے ایک صبح ہے، تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ دوسری طرف مغرب ہے، اور اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا۔

میں (قرطبی) نے کہا: رد کے سلسلہ میں یہ ابن عربی کی طرف سے ایک تکلیف وہ بات ہے جو انہوں نے اپنے ذمے لے لی ہے کہ اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا، ہم نے مجاہد سے ذکر کیا کہ طرف اوّل صبح کی نماز ہے، اس بات پر اتفاق ہے کہ جس نے طلوع فجر کے بعد کھا لیا یا جماع کر لیا تو اس کا وہ دن فطر کا دن ہوگا، اور اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ اور یہ جان بوجھ کر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب طلوع فجر کے بعد والا وقت دن کا حصہ ہو۔ تو صبح کے سلسلہ میں تو جو طبری نے کہا یہ اس کی صحت پر دال ہے، اب اس پر صرف مغرب کا اعتراض باقی ہے اور اس سلسلہ میں اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1069
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1068

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ یعنی رات کے حصے میں اور زلف سے مراد وہ گھڑیاں ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ اس سے مزدلفہ کا نام مزدلفہ ہے، کیونکہ وہ عرفہ کے بعد ایک ایسا مقام ہے جو مکہ کے قریب ہے۔ ابن قعقاع اور ابن ابی اسحاق وغیرہ نے وزلفا لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے زلیف کی جمع کہا ہے، کیونکہ یہ زلیف کے ساتھ بولا جاتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا واحد زلفۃ ہو جسے بسرۃ کا اور بسر یعنی اس آدمی کی لغت کے مطابق ہو گا جو سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھتا ہے۔ ابن محیصن نے وَ زُلْفًا مِّنَ الَّيْلِ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور واحد زلفۃ ہے جیسے درۃ اور در، اور برۃ اور بر۔ اور مجاہد اور ابن محیصن نے زلفی بروزن قربی بھی پڑھا ہے اور باقیوں نے وزلفا لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے غرفۃ اور غرف۔ ابن اعرابی نے کہا: زلف سے مراد ساعات ہے، اس کا واحد زلفۃ ہے اور ایک قوم نے کہا ہے: زلفۃ سورج کے غائب ہونے کے بعد رات کے پہلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں زلف اللیل سے مراد رات کی پہلی تہائی کی نماز یا عشاء کی نماز ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔ ایک قول کے مطابق مغرب، عشاء اور صبح ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا: اس سے رات کی نماز مراد ہے البتہ معین نہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ صحابہ و تابعین میں سے جمہور مفسرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں حسنات سے مراد پانچ نمازیں ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: حسنات سے مراد آدمی کا سبحان اللہ، والحمد للہ، لا إله إلا الله اور الله اکبر کہنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: نیکیوں میں یہ مثال کے طریقہ پر ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اس چیز کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفظ حسنات میں عام ہے اور سیئات میں خاص، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تو نے کبائر سے اجتناب نہیں کیا" (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: سبب نزول جمہور کے قول کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ انصار کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، ایک قول کے مطابق وہ ابو الیسر بن عمرو تھا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا نام عباد تھا، اس نے کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار کی، اسے بوسہ دیا اور فرج کے علاوہ اس نے اس کے ذریعہ لطف حاصل کیا۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: میں نے مدینہ کے کنارے میں ایک عورت کو گرا لیا اور میں نے جماع کے سوا اس کے ساتھ سب کچھ کر لیا اور اب میں حاضر ہوں آپ میرے بارے میں جو چاہیں فیصلہ فرما دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: اللہ نے تیری پردہ پوشی کی تھی، تو بھی اپنے اوپر پردہ ڈال لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب ارشاد نہیں فرمایا۔ وہ آدمی چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے بندہ بھیج کر اسے بلوایا، اور اس کے سامنے وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ کی تلاوت فرمائی۔ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: کیا یہ حکم اس کے ساتھ خاص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے ہے" (3)۔ ترمذی نے کہا: حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070 2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139

3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3037، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بوسہ لے لیا پھر نبی کریم ﷺ کے پاس اس کے کفارہ کے متعلق پوچھنے کے لیے آیا تو وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس آدمی نے کہا: کیا یہ حکم میرے لیے ہی ہے اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے لیے اور میری امت میں سے جس نے بھی یہ کام کیا''۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا: میرے پاس ایک عورت کھجور خریدنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا: کمرے میں اس سے زیادہ عمدہ کھجور پڑی ہے تو وہ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اسے بوسہ دے دیا، میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے بھی فرمایا: اپنے اس واقعہ کو چھپا، توبہ کر اور کسی کو اس کے بارے میں خبر نہ دے پس مجھ سے صبر نہ ہوسکا، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی غازی کے گھر والوں کی اس کی غیر حاضری میں خبر گیری کی ہے''(1)۔ حتیٰ کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس وقت اسلام لایا ہوتا اور میں نے یہ گمان کیا کہ میں دوزخیوں میں سے ہوں۔ راوی نے کہا: رسول اللہ ﷺ سر جھکا کر بیٹھے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ وحی نازل فرمائی: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ حضرت ابوالیسر نے کہا: میں آپ کے پاس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ میرے سامنے پڑھی تو آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا یہ صرف ان کے لیے خاص ہے یا تمام لوگوں کے لیے عام حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمام لوگوں کے لیے عام ہے''(2)۔ حضرت ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے، وکیع وغیرہ نے قیس بن ربیع کو ضعیف قرار دیا۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے توجہ ہٹالی اور عصر کی نماز ادا کی گئی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے، تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلایا اور فرمایا: ''کیا تم ہمارے ساتھ نماز میں حاضر تھے''(3)؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''جا یہ تیری کارروائی کا کفارہ ہوگیا ہے''(4)۔ اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو فرمایا: ''اٹھو اور چار رکعت ادا کرو''(5)۔ واللہ اعلم۔

اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ سے حدیث ''نوادر الاصول'' میں بیان کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے پرانے گناہ کے لیے نئی نیکی سے از روئے طلب کے زیادہ خوبصورت اور ادراک کے اعتبار سے زیادہ تیز کوئی چیز نہیں دیکھی(6)، اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ۔

مسئلہ نمبر5۔ یہ آیت کریمہ بمعہ ان احادیث کے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حرام بوسہ اور حرام لمس کی صورت میں حد واجب نہیں ہوتی۔ اور اس کے ذریعے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں پر کوئی حد اور تادیب نہیں ہوگی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3039، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً حدیث نمبر 3040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070

4۔ ایضاً۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	5۔ ایضاً	6۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 120

اگر چہ وہ دونوں ایک ہی کپڑے میں پائے گئے۔ یہ ابن منذر کا مختار مسلک ہے، کیونکہ جب اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا گیا تو اس حدیث کو اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ذکر کر دیا جائے گا کہ ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، اور سورۂ نور میں اس کی تفصیل آئے گی کہ علماء نے اس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نماز کو رکوع، سجود، قیام، قراءت اور اسماء سمیت اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ، الایۃ نماز قائم کرو۔ فرمایا اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الایۃ (الاسراء: 78) سورج کے ڈھلتے وقت نماز قائم کرو۔ فرمایا: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ (الروم) شام کے وقت اور صبح کے وقت اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝ (الروم) اور آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہے اور عشاء کے وقت اور ظہر کے وقت اس کی تسبیح بیان کرو۔ فرمایا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130) اپنے رب کی تسبیح بیان کر سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔ فرمایا: رکوع کرو اور سجدہ کرو یعنی ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا (الحج: 77) فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ۝ (البقرہ) اور اللہ کی خاطر ڈرتے ہوئے قیام کرو۔ فرمایا: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔ اور فرمایا وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا (الاسراء: 110) یعنی نماز میں بلند آواز سے قراءت نہ کر اور نہ ہی انتہائی پست آواز میں قراءت کرو۔ یہ سارے کا سارا اجمال ہے اور اس کی وضاحت اور بیان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا، اور ارشاد فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) اور ہم نے آپ پر ذکر (یعنی قرآن) اتارا تا کہ جو ان کی طرف اتارا گیا آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت صلوٰۃ، رکعات اور سجدوں کی تعداد، پوری نماز کا طریقہ، اس کے فرائض، سنتیں اور فرائض میں سے جن کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں اور جو اس میں سنن اور فضائل وغیرہ میں سے مستحبات ہیں انہیں بیان فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "صلوا کما رأیتمونی أصلی" (1) اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اور آپ سے مکمل تفصیلات منقول ہوئیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے پہلے لوگوں کی ضرورت کے جملہ معاملات کو بیان فرما دیا۔ دین مکمل ہو گیا، اور آپ نے راستہ واضح فرما دیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ: 3) آج تمہارے لیے میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کر لیا۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ یعنی قرآن نصیحت اور توبہ ہے اس آدمی کے لیے جو نصیحت حاصل کرے۔ اور نصیحت حاصل کرنے والوں کو قرآن کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور الذکری مصدر ہے جو الف تانیث کے ساتھ آیا ہے۔

وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 88

اُولُوۡا بَقِيَّةٍ يَّنۡهَوۡنَ عَنِ الۡفَسَادِ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَيۡنَا مِنۡهُمۡ‌ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِيۡهِ وَكَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور آپ صبر کیجئے بلا شبہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکوں کے اجر کو۔ تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے زیرک لوگ ہوتے جو روکتے زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنے سے مگر وہ قلیل تھے جنہیں ہم نے نجات دی تھی ان سے اور پیچھے پڑے رہے ظالم اس عیش و طرب کے جس میں وہ تھے اور وہ مجرم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اصۡبِرۡ یعنی نماز پر صبر کیجئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا (طٰہٰ: 132) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! آپ کو جو تکلیف اور اذیت ملے اس پر صبر کیجئے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ، محسنین سے مراد نماز قائم کرنے والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوۡلَا كَانَ، لولا بمعنی ھلا ہے۔ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ، قرون سے مراد امتیں اور قومیں ہیں یعنی ان امتوں میں سے جو تم سے پہلے تھیں۔ اُولُوۡا بَقِيَّةٍ یعنی اطاعت، دین، عقل اور بصیرت والے لوگ (1)۔ يَّنۡهَوۡنَ اپنی قوموں کو روکتے۔ عَنِ الۡفَسَادِ فِى الۡاَرۡضِ یعنی اس عقل کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی اور انہیں اپنی نشانیاں اور آیات دکھائی تھیں۔ یہ کفار کے لیے زجر و توبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں لولا نفی کے لیے ہے، یعنی ما کان من قبلکم تم سے پہلے نہیں تھے۔ جیسے اللہ کا ارشاد فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ (یونس: 98) یعنی ما کانت قریۃ آمنت کوئی بستی نہیں جو ایمان لائی ہوتی۔ اِلَّا قَلِيۡلًا استثنا منقطع ہے اس سے مراد لکن قلیلا ہے۔ مِّمَّنۡ اَنۡجَيۡنَا مِنۡهُمۡ کہ وہ زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ (یونس: 98) فرمایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ انبیاء کے متبعین اور اہل حق ہیں۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا یعنی انہوں نے شرک کیا اور نافرمانی کی۔ مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِيۡهِ یعنی مال اور لذات میں مشغول رہنے میں سے اور ان چیزوں کو آخرت پر ترجیح دینے جیسے کاموں میں پڑے رہے۔ وَكَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ اور وہ مجرم تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً‌ وَّلَا يَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِيۡنَ ۙ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ‌ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ‌ ؕ وَتَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کردے بستیوں کو ظلم سے حالانکہ ان میں بسنے والے نیکوکار ہوں۔ اور اگر چاہتا آپ کا رب تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک ہی امت (لیکن حکمت کا یہ تقاضا نہیں اس لیے) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں گے) اور اسی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 510

(رحمت) کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے اور پوری ہوگئی آپ کے رب کی (یہ) بات کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن وانسان (دونوں) سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کردے بستیوں یعنی بستیوں والوں کو۔ القری سے مراد اھل القری ہے۔ بِظُلْمٍ یعنی شرک اور کفر سے وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ یعنی ان کے درمیان حقوق کی باہم ادائیگی ہورہی ہو، یعنی ایسا نہیں کہ وہ انہیں صرف کفر کی وجہ سے ہلاک کرے یہاں تک کہ اس کے ساتھ ساتھ فساد بھی برپا ہوجائے، جس طرح مثلاً اس نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو کم تولنے کی وجہ سے ہلاک کیا اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو لواطت کی وجہ سے ہلاک کیا، اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا میں شرک کی نسبت نافرمانی اور گناہ ہلاکت و بربادی کے عذاب تک پہنچانے میں زیادہ کردار ادا کرتے ہیں، اگرچہ آخرت میں شرک کا عذاب زیادہ مشکل ہوگا۔ صحیح ترمذی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''لوگ جب ظالم کو دیکھتے ہیں اور اپنے سامنے اسے نہیں پکڑتے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے سب پر عذاب کو عام کردے''(1)۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو برباد کردے، حالانکہ ان میں رہنے والے مسلمان ہوں وہ توان کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور حقوق کی پامالی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، یعنی اس نے اعذار اور انذار کے بعد ہی کسی قوم کو ہلاک اور برباد کیا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ کسی کو اس طرح ہلاک کرے کہ وہ اس پر ظلم کررہا ہو، اگرچہ وہ اصلاح وہدایت کی انتہاء پر ہے، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی پر ظلم نہ کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا (یونس: 44) یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردے جب کہ وہ مخلص ہوں۔ مصلحون سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو ایمان میں مخلص ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ظلم سے مراد معاصی اور گناہ ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا(2): اُمَّةً وَّاحِدَةً سے مراد صرف ملت اسلامیہ ہے یعنی اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو صرف ملت اسلامیہ بنا دیتا۔ ضحاک نے کہا(3): اس سے مراد ایک دین والے ہیں یعنی سب کو گمراہ کردیتا یا پھر سب کو ہدایت یافتہ بنا دیتا۔ وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ یعنی مختلف ادیان پر رہیں گے۔ یہ مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی جس پر تیرے رب نے ایمان اور ہدایت کے ذریعے رحمت فرمائی تو اس نے اختلاف نہیں کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مختلفین فی الرزق ہیں(4) یعنی رزق میں اختلاف کرتے رہیں گے یا مختلف ہوں گے، یعنی یہ کہیں گے کہ یہ غنی ہے اور یہ فقیر، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ مگر وہ

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، ما جاء فی نزول العذاب، جلد 2، صفحہ 39۔ ایضاً، حدیث نمبر 2094، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511 3۔ ایضاً 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071

لوگ جن پر تیرے رب نے قناعت عطا فرما کر رحم کیا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ حضرت حسن، مقاتل اور عطا نے کہا: یہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے (1)، یعنی الله نے انہیں اختلاف کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا (2): اس سے مراد یہ ہے کہ الله نے اپنی رحمت کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اور الرحمۃ کے مونث ہونے کے باوجود وَلِذٰلِكَ فرمایا ولتلك نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رحمت کی تانیث حقیقی نہیں تو اسے فضل کے معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ذالك کے ساتھ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض اوقات ذلك کے ذریعے دو متضاد چیزوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے، جس طرح الله تعالیٰ کے ارشاد لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (البقرہ: 68) میں ہے، بَيْنَ ذٰلِكَ فرمایا ہے بین ذینك ولا تینك نہیں فرمایا۔ اور ایک اور مقام پر فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان) پھر فرمایا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) اور اسی طرح الله تعالیٰ کا ارشاد قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: 58) (ان سب ارشادات میں دو متضاد چیزوں کی طرف ذالك کے ذریعے اشارہ کیا گیا مثلاً فارض اور بکر، اسراف اور بخل، جہر اور سر اور آخری آیت میں فضل اور رحمت (مذکر اور مونث) کی طرف بھی ذالك کے ذریعے ہی اشارہ کیا گیا ہے)

اور یہ سب اقوال سے بہتر قول ہے، کیونکہ یہ عام ہے۔ اس کی طرف حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے جسے آپ سے اشہب نے روایت کیا: اشہب نے کہا: میں نے اس آیت کے متعلق امام مالک سے پوچھا تو انہوں نے کہا: الله تعالیٰ نے انہیں اس لیے پیدا فرمایا ہے تاکہ ایک فریق جنت میں ہو اور ایک فریق دوزخ میں، یعنی اہل اختلاف کو اختلاف کے لیے پیدا فرمایا اور اہل رحمت کو رحمت کے لیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: الله نے انہیں دو فریقوں میں پیدا فرمایا، ایک فریق پر وہ رحم فرماتا ہے اور ایک فریق پر رحم نہیں فرماتا۔ مہدوی نے کہا: اس تقدیر کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اصل کلام یوں ہے: ولا یزالون مختلفین إلا من رحم ربك و تمت كلمة ربك لأ ملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين، ولذالك خلقهم اور ایک قول کے مطابق یہ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ کے ارشاد کے متعلق ہے یعنی ولشهود ذلك القوم خلقهم اس دن کے شہود کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ کے متعلق ہے یعنی سعادت اور شقاوت کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے (3)۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ، تَمَّتْ کا معنی ثبت ہے، یعنی جس طرح اس نے ازل میں مقدر فرمایا اور خبر دی وہ ثابت ہو گیا، اور کلمے کے تمام سے مراد اس کا تغیر و تبدیل کو قبول کرنے سے ممتنع ہونا ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ، من بیان جنس کے لیے ہے۔ یعنی لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ تاکید ہے، جس طرح الله تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ جہنم کو بھرے گا اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس کے ذریعے یہ خبر بھی دی ہے کہ وہ جنت کو بھرے گا آپ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر ایک کو تمہیں میں سے لوگوں کے ذریعے بھرے گا"۔ اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ گزر بھی چکی ہے۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

"اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لیے ہیں کہ پختہ کریں ان سے آپ کے قلب (مبارک) کو اور آیا ہے آپ کے پاس اس سورہ میں حق اور یہ نصیحت اور یاددہانی ہے اہل ایمان کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ، كُلًّا، نقص کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہوگا ہر وہ جس کو رسولوں کی خبروں کی ضرورت ہو تو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کلا حال مقدم ہے۔ جس طرح آپ کا قول کلا ضربت القوم، مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ یعنی ان کی خبریں اور اپنی قوم کی اذیتوں پر ان کا صبر۔ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ تا کہ ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو اداء رسالت اور اس سلسلہ میں آپ کو ملنے والی اذیتوں پر صبر پر پختہ کر دیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کے ذریعے ہم آپ میں پختگی اور یقین میں اضافہ کر دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو ہم مضبوط کر دیں۔ ابن جریج نے کہا: ان کے ذریعے آپ کے دل کو ہم بہت زیادہ صبر کرنے والا بنا دیں تا کہ آپ جزع فزع نہ کریں۔ اہل معانی نے کہا: ہم طیب و پاک کریں۔ تمام کا معنی قریب قریب ہے۔ ما، کلا سے بدل ہے معنی ہوگا: نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ۔

وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ، هٰذِهِ سے مراد هذه السورة ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر سے مروی ہے کہ اس سورت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انبیاء، جنت اور دوزخ کی خبریں ہیں (1)۔

ایک قول یہ ہے: اس سورت کا بالخصوص ذکر تاکیداً ہے ورنہ حق تو پورے کے پورے قرآن میں ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: هذه الدنیا ہے اور مراد نبوت ہے۔ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، مَوْعِظَةٌ سے مراد گزشتہ امتوں کی ہلاکت اور جھوٹی اور برباد ہونے والی قوموں کے واقعات میں سے جن کے ذریعے نصیحت حاصل کی جاتی ہے، اور یہ اس سورت کی شرافت ہے، کیونکہ اس کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی حق، نصیحت اور یاددہانی ہے مگر ان میں بالخصوص اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح اس کے بارے میں ہے۔

وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی وہ ہلاک و برباد ہونے والوں کے اوپر نازل ہونے والی مصیبت کو یاد کرتے ہیں تو توبہ کر لیتے ہیں، اور مومنین کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے واقعات کو سن کر وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2 صفحہ 512

وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۟ۙ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۟ وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۟۠

''اور آپ فرما دیجئے انہیں جو ایمان نہیں لائے کہ تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر اور ہم (اپنے طور پر) عمل پیرا ہیں۔ اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں اور الله ہی کے لیے ہیں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام، تو آپ بھی اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ کیجئے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ دھمکی اور وعید ہے۔ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۟ۙ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ دوسری دھمکی ہے اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی زمین و آسمان کے غیب اور ان کی شہادت الله ہی کے لیے ہے۔ شہادت کو معنی کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد آسمان اور زمین کے خزانے ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے آسمانوں اور زمین کی جو چیزیں بندوں سے غائب ہیں وہ ساری مراد ہیں۔ باقیوں نے کہا: غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے عذاب کا آسمان سے نزول اور زمین سے طلوع مراد ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں غائب ہے اس کو الله جانتا ہے۔ غیب کو مضاف کیا اور یہ مفعول کی طرف مضاف ہے تو اس کی اضافت توسعاً ہے، کیونکہ حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں: غبت فی الارض وغبت ببلد کذا میں زمین میں غائب ہوا اور میں فلاں شہر میں غائب ہوا۔ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ یعنی قیامت کے دن سارے کام اسی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ مخلوق کو تو اس کے اذن کے بغیر امر کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ نافع اور حفص نے یرجع یاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی لوٹائے جائیں گے۔ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ یعنی اس کی پناہ لو اور اس پر بھروسہ و اعتماد کرو۔ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔ اہل مدینہ، اہل شام اور حفص نے تعملون تا کے ساتھ مخاطب کے صیغے کے طور پر پڑھا ہے۔ جب کہ باقیوں نے بطور خبر یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اخفش سعید نے کہا: تعملون ہوگا بشرطیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مخاطب نہ ہوں، اس نے کہا: بعض نے تعملون تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے اور فرمایا: آپ ان کو کہہ دیجئے وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۟ ۔ کعب احبار نے کہا: تورات کا خاتمہ ہی سورت ہود کا خاتمہ ہے (1)۔ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے لے کر سورۃ کے آخر تک سورت ہود مکمل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ یوسف علیہ السلام ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12 صفحہ 176